پرتشدد انتہا پسندانہ رویئے: رویوں کی سائنس کیا کہتی ہے

انریک فاتاس

پروفیسر معاشیات، یونیورسٹی آف ایسٹ اینگلیا، برطانیہ

لینا ماریا ریسٹریپو پلازا

ایسوسی ایٹ لیکچرر، سکول آف اکنامکس، یونیورسیدید دیل والے، کولمبیا

طالبہ پی ایچ ڈی، یونیورسٹی آف ایسٹ اینگلیا، برطانیہ

عمر تاج

ڈاکٹورل ریسرچر، بیہیویورل سائنس گروپ، وارویک بزنس سکول

ایم ایس سی لندن سکول آف اکنامکس اینڈ پولیٹیکل سائنس

کتنی راہیں پرتشدد انتہا پسندی کو جاتی ہیں؟ ریڈیکلائزیشن کا تعین کن کن باتوں سے ہوتا ہے؟ کسی بھی پرتشدد گروہ کے بننے اور کام کرنے کو سمجھنا ہو تو کیا ثقافتی عوامل اس میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں یا کسی تنظیم یا فرد کی خصوصیات؟ بدقسمتی سے ان سوالوں کے جو بھی جواب ملتے ہیں وہ پرتشدد انتہا پسندی کو محض جزوی حد تک اور کسی قدر ٹوٹے پھوٹے انداز میں سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر بڑی محدود پالیسی سفارشات سامنے آتی ہیں۔

پرتشدد انتہا پسندی کے کئی رخ ہیں جنہیں مختلف نقطہ ہائے نظر سے دیکھیں تو یہ اس کے اسباب کو جزوی حد تک اجاگر کرتے ہیں۔ نفسیات کہتی ہے کہ کسی فرد کا سادہ سا پروفائل اس کے جذبات (جن میں غصہ، غرور، طیش، فرسٹریشن، مایوسی سبھی شامل ہیں) کے پیچیدہ مجموعے اور پرتشدد انتہا پسندی کے پس پردہ سماجی، اقتصادی، مذہبی یا نسلی و قوم پرستانہ مقاصد کا پوری طرح احاطہ نہیں کر پاتا۔ ٹھوس نفسیاتی شواہد کے ذریعے آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ حتیٰ کہ تشدد کی کارروائیاں (یعنی خودکش مشن) بھی کسی نفسیاتی عارضے کی علامات نہیں بلکہ انفرادی اور ماحولیاتی عوامل کے ایک مجموعے کا اثر ہیں۔ عام لوگ جہاں بظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ ذہنی خلفشار کا شکار، غریب اور کم تعلیم یافتہ ہیں وہیں سروے ڈیٹا کے تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم کی کمی اور غربت کو دیکھ کر آپ یہ پیش بینی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص پرتشدد انتہا پسند بنے گا یا نہیں۔[1] ثابت ہو چکا ہے کہ کم و بیش 18 فیصد خودکش حملہ آور جنہوں نے 2000 اور 2005 کے درمیان ہونے والے حملوں میں حصہ لیا، اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکے تھے یا کر رہے تھے۔

انفرادی سطح کا تجزیہ بہت الجھا ہوا ہو تو تنظیمی پہلو یہ سمجھنے میں مدد دے سکتے ہیں کہ بعض گروہ اتنے جہاندیدہ افراد کو اپنی طرف مائل کرنے میں کیوں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تنظیموں کی عمرانیات سے پتہ چلتا ہے کہ سماجی اعتراف، کمیونٹی سہولیات، حمایت کے ٹھوس نیٹ ورک اور ہر بات کو پوشیدہ رکھنے کی روش کا ایک موزوں مجموعہ کسی مقصد اور پرتشدد انتہا پسندی کے ساتھ وابستگی میں اضافہ کر سکتا ہے۔ ماہرین سیاسیات کی طرف سے کئے گئے مختلف گروہوں اور معاشروں کے تجرباتی تجزیہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفسیاتی اور تنظیمی محرکین کا انحصار سیاق و سباق پر ہوتا ہے۔[2] انتہائی شدید ماحولیاتی دباؤ کا شکار لوگوں میں کوئی دو چار ہی ایسے ہوتے ہیں جو بالآخر تشدد کا راستہ اپنانے کی ٹھان لیتے ہیں اور کسی ایک تنظیم میں جہاں کھانے کھلانے کی رسمیں انتہائی کامیاب ثابت ہو سکتی ہیں (یعنی سری لنکا کے بلیک ٹائیگر) وہیں آزاد سماجی تنظیموں کے فنڈز کے ذرائع سے یہ سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے کہ مذہبی گروہ غیر مذہبی ریڈیکل لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کیوں کامیاب ہو رہے ہیں (یعنی القاعدہ)۔

بعض اوقات صرف سماجی عوامل (سماجی محرومی) کے مجموعے اور سماجی محرکین (بالخصوص تعلیمی پس منظر) سے ہی بعض بے قاعدگیوں کی وضاحت ہو جاتی ہے (یعنی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے والے افراد کا تناسب پرتشدد اسلامسٹوں میں تین سے چار گنا تک زیادہ کیوں ہے)۔[3]

اب سوال یہ ہے کہ ہم نفسیات، عمرانیات اور سیاسیات سے ملنے والے ان تمام مختلف عناصر کو ایک سوچ کی شکل میں کس طرح ملاتے ہیں؟ پالیسی کے لئے ہم مختلف طریقوں سے کارآمد سبق کس طرح اخذ کرتے ہیں؟ رویوں کی سائنس مختلف سوشل سائنسز کے طریقوں اور ان سے حاصل ہونے والے سبق کو ملا کر ایک دلچسپ فریم ورک پیش کرتی ہے جس کے ذریعے ہم پرتشدد انتہا پسندی کے ظہور میں ماحولیاتی عوامل (مذہب، تعلیم، غربت، سماجی اخراج، گروہی شناخت) اور انفرادی خصوصیات کو ملا کر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ رویوں کی سائنس میں کئی طرح کے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیس سٹڈیز یہ سمجھنے کے لئے کارآمد رہتی ہیں کہ تشدد کس طرح پرخطر ماحول پیدا کرتے ہوئے خطرناک رویوں کو عوام الناس میں منتقل کرتا ہے۔ سروے اور انٹرویو کے ذریعے انتہا پسندوں کا تفصیلی خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور معاشرتی (یعنی عدم مساوات) و تنظیمی (یعنی نیٹ ورک کا ڈھانچہ) پہلوؤں کے درمیان

1. See, for instance, Benmelech, E. and Berrebi, C., 2007. Human capital and the productivity of suicide bombers. The Journal of Economic Perspectives, 21(3), pp.223-238.
2. See the excellent survey of Crenshaw, M. 2007. Explaining Suicide Terrorism: A Review Essay. Security Studies, 16, 1, pp. 133-162.
3. Gambetta, D. and Hertog, S., 2009. Why are there so many Engineers among Islamic Radicals?. European Journal of Sociology, 50(02), pp.201-230

پائے جانے والے بعض تعلقات کی توثیق کی جاتی ہے۔ آخر میں رویوں کے ماہرین ایک کنٹرول کے تحت تحقیق کرتے ہوئے ایسی مراعات، جذبات، سماجی محرکین اور اداروں کا تعین کرتے ہیں جو کسی خاص سیاق وسباق میں پرتشدد انتہاپسندی کا باعث بن سکتے ہیں۔

ماہرین معاشیات نے مختلف شعبوں کو ملا کر استعمال کئے جانے والے اس طریقے میں نمایاں کردار ادا کرتے ہوئے ''رویوں کی گیم کے نظریہ'' (Behavioural Game Theory)[4] پر مبنی ایک نظریاتی ڈھانچہ فراہم کیا ہے۔ معاشیات کے نظریہ سازوں نے ایسے ماڈل تیار کئے ہیں جو پرتشدد انتہاپسندوں کے فیصلوں میں رویئے کے بنیادی عناصر کا احاطہ کرتے ہیں۔ انہوں نے پالیسی سازوں اور حکومتوں کے فیصلوں کے اوصاف بھی متعین کئے ہیں۔ ان ماڈلز کو فیلڈ میں یا ایک کنٹرول کے تحت ماحول میں آزما کر رویوں کی سائنس کے ماہرین نے بالعموم اور رویوں کے ماہرین معاشیات نے بالخصوص پرتشدد انتہاپسندی پر ہماری سمجھ بوجھ بہتر بنانے میں بہت مدد دی ہے۔

یہ طریقہ کس طرح کام کرتا ہے؟ رویوں کی سائنس کے ماہرین ایسے سٹریٹجک ماحول تیار کرتے ہیں (جنہیں ہم 'گیمز' کا نام دیتے ہیں) جن میں افراد (جنہیں ہم 'کھلاڑی' کہتے ہیں) فیصلے کرتے ہیں۔ مخصوص ادارے مختلف کرداروں (ایسے افراد جو کسی پرتشدد کارروائی میں حصہ لینے کا سوچ رہے ہوں یا ایسی حکومتیں جو پرتشدد کرداروں کو سامنے آنے سے روکنے کی کوشش کر رہی ہوں) کے درمیان میل جول کی حدود طے کرتے ہیں۔ ان 'گیمز' کی تشکیل، ان کے قواعد اور مراعات میں تبدیلیاں کر کے ہم نہ صرف کھلاڑیوں کے طرزعمل کے بارے میں بلکہ تشدد کی کسی کارروائی کرنے میں ان کی کامیابی کے امکان پر بھی پیش گوئیاں کر سکتے ہیں۔ بہرحال یہ گیمز حقیقی دنیا کا تجریدی روپ ہوتی ہیں جن میں کسی خاص صورتحال کے محض بنیادی پہلو شامل ہوتے ہیں۔ ہر وہ گیم جسے عملی جامہ پہنایا جاتا ہے اس کے لئے ہم آسانی سے متوقع نتائج کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ آیا فیصلے میں حصہ لینے والا کوئی فرد سوچ کے خودغرضی، عقلی انداز پر مبنی کسی خاص منطق پر چل رہا ہے اور اسی کردار کی طرف سے کئے جانے والے عقلی فیصلے کی پیش بینی بھی کی جا سکتی ہے۔ فیصلہ سازی کے عمل میں موجود دیگر عناصر (یعنی گروہی شناخت، جذبات مثلاً غصہ، سماجی اقدار) کو ملا کر ہم اپنے تجزیوں میں زیادہ حقیقت پسندانہ عوامل کو ضم کر لیتے ہیں۔ رویوں کی تحقیقی سرگرمیوں میں ان حقیقت پسندانہ ماڈلز کی پیش گوئیوں کو آزما کر ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے علم میں ردوبدل کر سکیں، اسے بہتر بنا سکیں اور حکومتوں کو زیادہ حقیقت پسندانہ مشورے دے سکیں۔

پرتشدد انتہاپسندی کے تجزیہ کے لئے دیگر طریقوں کے مقابلے میں رویوں پر تجرباتی سوچ اپنانے کے بھی بعض فائدے ہیں۔ ایسا ہی ایک فائدہ یہ ہے کہ رویوں پر کی جانے والی تحقیق میں چونکہ شرکاء کو کسی ترتیب کے بغیر متبادل حالات دیئے جاتے ہیں یا علاج کے طریقے آزمائے جاتے ہیں اس لئے طرزعمل میں سامنے آنے والے کسی بھی فرق کو علاج کے طریقوں کے درمیان فرق سے جوڑا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں علاج کے طریقے اور نتیجے کے درمیان جہاں کہیں اتفاقیہ کچھ ہوتا ہے اس کی سمت کا تعین یہ کردار سونپنے کے لئے اپنایا جانے والا طریقہ کرتا ہے۔ خیال رہے کہ اس اتفاقیہ تعلق کا تعین غیر تجرباتی ڈیٹا میں اتنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پرتشدد انتہاپسندی کا مطالعہ کرنا ہو اور تشدد میں کمی کے لئے پالیسی معلومات فراہم کرنا ہوں تو رویوں کی تحقیق کئی فوائد کا باعث بنتی ہے۔ اپنی ریاضیاتی شکل ('گیمز') کی طرح تجربات میں شرکاء کو اپنے فیصلے کے ماحول میں کوئی حقیقت نما صورتحال فراہم کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ اس طرح تشکیل دیئے جاتے ہیں کہ کسی خاص صورتحال کے اہم پہلوؤں کو الگ الگ کر کے الگ حیثیت میں ان کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس طرح ہمیں اس تحقیق سے حاصل ہونے والی ڈیٹا کی تیاری کے عمل پر بہتر کنٹرول مل جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کسی خاص ترتیب کے بغیر تجربات، یا کسی خاص ترتیب کے بغیر کنٹرول یا فیلڈ ٹرائل میں متعلقہ آبادی سے بے ترتیب لئے جانے والے ارکان مراعات پر مبنی فیصلے کرتے ہیں۔ اثرات چونکہ حقیقی ہوتے ہیں اس لئے ان کے فیصلے ان کے اپنے لئے اثرات کے حامل ہوتے ہیں، جس سے دیگر شعبوں میں کی جانے والی تحقیق سے جڑے بعض مسائل کو کم یا ختم ہو جاتے ہیں۔

ترتیب کے بغیر تحقیق کا دوسرا فائدہ اس سے حاصل ہونے والا ڈیٹا ہے۔ ڈیٹا کے حصول کے دیگر طریقوں کو استعمال کرتے ہوئے پرتشدد انتہاپسندی پر ڈیٹا کے معیار کو کنٹرول کرنا خاص طور پر مشکل ہوتا ہے کیونکہ معلومات کو غلط طور پر پیش کرنے میں ہر فریق (انتہاپسند اور حکومت) کی اپنی اپنی مراعات ہوتی ہیں اور معلومات افشاء کرنے کے اپنے اثرات ہوتے ہیں (جیسے گرفتاری یا سکیورٹی کی ناکامی)۔ رویوں کا طریقہ استعمال کرتے ہوئے ہم ان مسائل سے بچ جاتے ہیں اور اس کی بدولت ہم قومی سلامتی کے امور نمٹانے کے معاملے میں مختلف اداروں کی افادیت کو بھی جانچ سکتے ہیں۔

یہ طریقہ بہتر پالیسیوں کی تشکیل کے لئے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ انسداد تشدد کی پالیسیاں اس طرح تشکیل دینا ضروری ہوتا ہے کہ یہ فیلڈ میں موجود لوگوں کے رویئے پر اثر انداز ہوں۔ موثر پالیسی تشکیل کے لئے اس بات کو بہتر طور پر سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ان کا طرزعمل عقلی کردار کے ماڈل سے کس طرح اور کس حد تک ہٹ کر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ رویئے کے طریقے تمام فیصلوں میں نفسیاتی قوتوں اور تنظیمی عوامل کو الگ الگ تھلگ کرنے میں بھی موثر ثابت ہوتے ہیں۔ رویوں کی سائنس نہ صرف دوسروں کے طرزعمل کو زیادہ گہرائی تک سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ یہ انتہائی پرتشدد کارروائیوں پر صدمے کی کیفیت میں ہمارے اپنے طرزعمل کو کسی جھکاؤ سے پاک رکھتے ہوئے ہماری فیصلہ سازی کو بہتر بناتی ہے۔

ہمارا سابقہ کام اس کردار کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حال ہی میں شائع ہونے والی ایک مطالعاتی تحقیق[5] میں ہم نے پرتشدد انتہاپسندی کے خاتمہ کی متبادل پالیسیوں کا جائزہ لیا جن میں وہ پالیسیاں بھی شامل تھیں جو اس کے اثرات کو کم کرتی ہیں (یعنی دیگر حکومتی اداروں کے لئے ایک منفی بیرونی پہلو پیدا کرنا) اور ایسی پالیسیاں بھی جن میں انتہاپسندی کی روک تھام پر وسائل لگائے جاتے ہیں (تشدد کے مجموعی خطرے کو کم کرتے ہوئے ایک مثبت بیرونی پہلو پیدا کرنا)۔ ہم نے مختلف متعلقہ کرداروں (جیسے حکومتیں) میں روک تھام کی پالیسیوں پر اٹھنے والے اخراجات میں شریک مختلف اداروں کی موثر حیثیت کا خاص طور پر جائزہ لیا۔ ہمارے نتائج بھرپور انداز میں ظاہر کرتے ہیں کہ اخراجات میں شراکت روک تھام کی حکمت عملیوں کے انتخاب اور ان کی مجموعی افادیت پر ایسا اثر ڈالتی ہے جو سیدھی لکیر کی طرح نہیں چلتا۔ مختلف ادارے جب شروع میں ایک مضبوط اور پختہ عزم کر لیں اور اخراجات میں شراکت کی سطح بلند ہو تو ہمیں پالیسی کوآرڈینیشن میں نمایاں بہتری دیکھنے کو ملتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فوری طور پر حمایت کی جو سطح سامنے آتی ہے اس میں کوئی نمایاں فائدہ نظر نہیں آتا جو ابتدائی پیش گوئی کے نظریہ کے عین برعکس ہے۔

رویوں کا یہ طریقہ پرتشدد انتہاپسندی کو آگے بڑھانے والے معاشرتی عوامل کو گہرائی تک سمجھنے میں کس طرح مدد دیتا ہے؟ اپنے ایک مختلف کام میں کچھ عرصہ پہلے ہم نے سینٹی فورٹ جارڈن اینڈ سینڈلر کے زیر اہتمام کی گئی ایک ''میٹا سٹڈی'' کے مضمرات کا جائزہ لیا۔[6] اپنی میٹا سٹڈی میں انہوں نے اس بات کی نشاندہی کی کہ معاشی و سیاسی عدم مساوات کس طرح گھریلو اور لین دین کے معاملات میں پرتشدد کارروائیوں کو ہوا دیتی ہے۔ رویوں پر اپنی تحقیق میں ہم نے انتہاپسندی کے پیچھے سماجی، معاشی اور عوامل کی گتھیوں کو سلجھایا جس کے لئے ہم نے کنٹرول کے تحت رویوں پر تحقیق کا طریقہ استعمال کیا۔ اس پر یہ دلچسپ بات سامنے آئی کہ معاشی عدم مساوات جہاں تشدد میں محدود اثر دکھاتی ہے وہیں سیاسی عدم مساوات پرتشدد واقعات کی تعداد میں بے پناہ اضافے کا باعث بنتی ہے اور سیاسی عدم مشابہتوں کی موجودگی میں ہنرمند افراد ریڈیکلائزیشن کی طرف زیادہ مائل ہوتے ہیں۔ اس سیاق وسباق میں تشدد پر فلاحی پالیسیوں کا اثر برائے نام ہے۔ دہشت گردی کے لئے اقوام متحدہ کی تعریف (''کسی سیاسی مقصد کو آگے بڑھانے کی کوشش میں شہریوں کی زندگیوں کو تباہ کرنے یا گزند پہنچانے والی کارروائی'') اور سینٹی فورٹ جارڈن اینڈ سینڈلر کے نتائج کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس بات کا تعین کیا کہ ایک جیسی مہارتوں کے حامل افراد جو ایک جیسی انفرادی خصوصیات رکھتے ہوں، ایک خاص ماحولیاتی عامل یعنی سیاسی اخراج کی موجودگی کی شرط پر پرتشدد کارروائیوں میں حصہ لینے یا حصہ نہ لینے کا فیصلہ کس طرح کرتے ہیں۔

اب ان ساری باتوں کو ہم پاکستان کے حالات پر کس طرح لاگو کرتے

4. Behavioral Game Theory analyzes the strategic interaction among individuals from a realistic perspective, incorporating elements from psychology (emotion), philosophy (moral obligation), sociology (peer effects), or neurology (cognitive limits) to its models.

5. Kass, Malcolm, Enrique Fatas, Catherine Eckel, and Daniel Arce. "The UN in the lab"; Social Choice and Welfare 45, no. 3 (2015): 625-651.

6. Santifort-Jordan C, Sandler T. "An empirical study of suicide terrorism: a global analysis"; Southern Economic Journal. 2014 Apr 1;80(4):981-1001.

ہیں؟ معاشرتی، سیاسی اور معاشی عوامل کا موجودہ ماحول جس میں پاکستانی نوجوان پرخطر صورتحال سے دوچار ہیں، رویوں کی سائنس کے طریقے استعمال کرنے کے لئے تقریباً موزوں ترین پلیٹ فارم فراہم کرتا ہے۔ پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی سے نمٹنے کی کوششیں بہت زیادہ کمیونٹی سے متعلق رہی ہیں جن میں سکولوں میں تعلیمی پروگراموں کے ذریعے اور ریڈیکلائزیشن کا شکار نوجوانوں پر کام کرنے کے علاوہ متبادل سرگرمیوں مثلاً پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں کی فراہمی کے ذریعے اس مسئلے سے نمٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ طریقے اگرچہ زندگی کا معیار بہتر بنانے اور انفرادی استعداد کو ترویج دینے کے لئے سودمند ہو سکتے ہیں لیکن یہ رویوں اور ذہنیت میں تبدیلیاں لانے کی بھرپور صلاحیت نہیں رکھتے۔ پرتشدد انتہاپسندانہ ذہنیت سے نمٹنے کے لئے عارضی حل نکالنے کے بجائے اصل جڑ کو پوری طرح سمجھنا زیادہ ضروری اور موثر ہوگا۔ پاکستان کے سیاق وسباق میں رویوں کی سائنس کے طریقے ابھی تک متعارف نہیں کرائے گئے جو ایسے نتائج دکھانے کی استعداد رکھتے ہیں جو ابھی تک حاصل نہیں کئے جا سکے۔

بھرتی کے لئے نوجوان پرتشدد انتہاپسندوں کا پہلا ہدف رہے ہیں۔ ان کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ انہیں زیادہ آسانی سے ڈھالا جا سکتا ہے اور زیادہ آسانی سے بھرتی کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کا شمار دنیا کے ان ملکوں میں ہوتا ہے جہاں نوجوانوں کی آبادی سب سے زیادہ ہے جس کی وجہ سے ملک کے لئے پرتشدد انتہاپسندی کے بڑھتے رجحان کا خطرہ اور بڑھ جاتا ہے اور انتہاپسند تنظیمیں اور ان میں بھرتی کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ عام خیال ہے کہ غربت اور تعلیم کی کمی نوجوانوں میں عدم برداشت اور پرتشدد انتہاپسندی کی جانب جھکاؤ کا باعث بنتی ہیں لیکن محض یہی وہ عوامل نہیں جو اس میں اپنا کام دکھاتے ہیں تاہم یہ مسائل اور حالات اپنا اثر ضرور دکھاتے ہیں۔ اگرچہ غربت بذات خود شاید کسی کو پرتشدد انتہاپسندی والی زندگی اپنانے پر مائل نہیں کر سکتی لیکن غربت کی بلند سطح، تعلیم کی کمی، مضبوط مذہبی یا سماجی اقدار، یا سیاسی اخراج کے غیر موزوں نظام سب مل کر پاکستانی نوجوانوں کو ایک پرخطر صورتحال سے ضرور دوچار کرتے ہیں۔

پاکستانی نوجوانوں کی نفسیات اور پرتشدد انتہاپسندی میں شامل ہونے پر ان کے جھکاؤ کے تجزیہ کے لئے مواقع کی کمی سے پیدا ہونے والی پرخطر صورتحال زیادہ بہتر نقطہ آغاز ہو سکتا ہے۔ رویوں کی سائنس کے نقطہ نظر سے ان عوامل کے اثرات کی پیمائش اس بات کو پوری طرح سمجھ کر کی جا سکتی ہے کہ کون سی کمیاں ہیں جو پرتشدد انتہاپسندی کی جانب ترغیب میں زیادہ اہم اور بتدریج کردار ادا کرتی ہیں۔ بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے مواقع کی کمی کی صورت میں موجود پرخطر صورتحال کا نقطہ نظر زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ یہ طریقہ پہلے سے محرومی کا شکار طبقات کو مزید محرومی سے دوچار نہیں کرتا اور اس کے ذریعے مسئلے کو زیادہ جامع اور درست انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

رویوں کی سائنس پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی کی روک تھام کا وسیلہ بھی بن سکتی ہے جس کا ماضی میں جائزہ نہیں لیا گیا۔ اس فریم ورک کو استعمال کرنے کے فائدے وسیع اور دوررس ہیں جو پاکستان میں مسلسل بڑھتے اس مسئلے پر ایک نیا نقطہ نظر سامنے لا سکتے ہیں اور نئے حل پیش کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں تعلیم کس طرح ریڈیکلائزیشن کا شکار ہو رہی ہے

ڈاکٹر پرویز ہودبائی

پروفیسر ریاضی، فزکس، سوشیالوجی
فورمین کرسچن کالج، لاہور

مقامی اخبارات میں متوسط طبقے کے امیر گھرانوں اور عمدہ تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل مذہبی رجحان رکھنے والے ایسے نوجوانوں کی کئی خبریں شائع ہو چکی ہیں جنہوں نے لوگوں کو قتل کرنے کی منصوبہ بندی کی اور اس پر عمل بھی کیا جن میں صفورا گوٹھ اور پریڈ لین مسجد جیسے وحشیانہ قتل عام کے واقعات بھی شامل ہیں۔ داعش اور حزب التحریر جیسے اسلامی گروہ نوجوان کٹر پسندوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

ان مثالوں کی موجودگی میں اب مذہبی انتہا پسندی کو غربت یا تعلیم کی کمی سے منسوب کرنے کا تصور باقی نہیں رہ جانا چاہئے۔ پھر بھی وہی بھیڑ چال کہ کئی حلقے مصر ہیں کہ پرتشدد انتہا پسندی کا حل یہی ہے کہ زیادہ سکول بنائے جائیں اور تعلیم کے لئے زیادہ فنڈز فراہم کئے جائیں۔ یہ لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری ہیں کہ تعلیم دہشت گردی کی پرورش کرتی ہے اور اسے ہوا دیتی ہے۔ تعلیم بڑھانے سے دہشت گردی کم نہیں ہوگی بلکہ بڑھے گی۔ اس کی وضاحت کچھ یوں ہے۔

تعلیم جب لبرل اقدار کی علمبردار ہو تو یہ فطری طور پر انتہا پسندی کی دشمن ہوتی ہے کیونکہ یہ ذہن کو تقویت اور وسعت عطا کرتی ہے، انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ ضروری نہیں کہ وہ کسی سوچ کو قبول کرے لیکن اس پر غور ضرور کرتا ہے، اور اسے ایک ایسے معاشرے میں رہنے پر آمادہ کرتی ہے جو جمہوری ہو، رواداری پر مبنی ہو اور متنوع ہو۔ انتہا پسندی اپنی تعریف کی رو سے ایک ذہنیت کا نام ہے جو صرف ایک سچائی کو قابل قبول تصور کرتی ہے۔ یہ لبرل ازم کے عین برعکس ہے۔

لیکن پاکستانی تعلیم لبرل مقاصد کو کھلم کھلا مسترد کرتی ہے۔ امیر اور غریب سکولوں، شہروں اور دیہات اور مختلف صوبوں میں ملنے والی تعلیم مختلف ہے۔ لیکن یہ تعلیم کس راہ پر آگے بڑھے گی اس کا تعین بنیادی طور پر سکول نصاب، نصابی کتب، اساتذہ اور امتحانات کرتے ہیں۔ سرکاری تعلیمی پالیسیوں میں جو کچھ کہا جاتا ہے، نصابی کتب میں شامل مواد اور امتحانات میں پوچھے جانے والے سوالات سے جو کچھ پتہ چلتا ہے اور ٹی وی کی معروف شخصیات جن باتوں پر زور دیتی ہیں، ان کی روشنی میں اس کا بیانیہ کچھ اس طرح ہے:

☆ طلبہ کو لازماً پڑھایا جائے کہ پاکستان مسلمانوں نے اسلام کے نام پر اور دو قومی نظریہ کے تحت بنایا تھا۔ لہٰذا اس ملک کی سرحدوں کے اندر غیر مسلم رہ تو سکتے ہیں لیکن وہ مساوی سلوک کی توقع ہرگز نہیں کر سکتے۔ ماسوائے اسلام کے، تمام مذاہب چونکہ غلط ہیں لہٰذا ہر طالب علم کو، چاہے وہ مسلمان ہو یا نہ ہو، اسلامی اصولوں اور مروجہ طریقوں کے بارے میں معلوم ہونا چاہئے۔ لیکن مسلمان طلبہ کے لئے دیگر مذاہب کی مثبت باتوں کے بارے میں کچھ جاننا ضروری نہیں۔

☆ ایک محاصرے اور حالت جنگ کا احساس پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا طلبہ کو بتایا جائے کہ پاکستان کے دشمن ہر لمحہ اسے کمزور کرنے کے منصوبوں اور سازشوں میں مصروف ہیں۔ وفاقی وزارت تعلیم (1995) کی پانچویں جماعت کی نصابی دستاویز کے مطابق طلبہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان ''قوتوں کو جانیں اور ان کی نشاندہی کریں جو پاکستان کے خلاف سرگرم عمل ہیں''، انہیں ''پاکستان کے خلاف بھارت کے مذموم عزائم'' کا پتہ ہونا چاہئے اور وہ ''جہاد اور شہادت پر تقریریں کرنے'' کی مشق کریں۔

☆ ثقافت اور نسلی و لسانی ورثہ کی اہمیت کم کی جائے۔ پاکستانی معاشرے کے تنوع کا اعتراف دراصل ممنوع سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے غالباً قومی تعمیر کا عمل کمزور پڑتا ہے۔ جنوبی ایشیائی شناخت کو بھی مسترد کیا جاتا ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے شائع ہونے والی نصابی کتب میں بلوچوں کو ''غیر مہذب اور ظالم''[1] قرار دیا گیا ہے جس پر مارچ 2016 میں قومی اسمبلی کے بلوچ ارکان نے تنقید کی۔ یہ معاملہ پارلیمان کے ایوان بالا میں اٹھایا گیا اور اس بات کی نشاندہی کی گئی کہ پنجاب میں بارہویں جماعت میں سوشیالوجی کی جو کتاب پڑھائی جا رہی ہے اس کے مطابق بلوچ ''غیر مہذب لوگ ہیں جو قتل و غارت کرتے ہیں''۔

☆ مطالعہ پاکستان کی سرکاری طور پر تجویز کردہ کئی کتابوں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ پاکستان 1947 میں قائم نہیں ہوا بلکہ اسی دن قائم ہو گیا تھا جب 712 عیسوی میں عرب حملہ آور محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا۔

☆ ہر بات کو اسلام کے ساتھ جوڑنا ناگزیر ہے۔ لہٰذا جمہوریت، شخصی و سیاسی آزادی، ثقافت، طرز زندگی، خواتین اور مذہبی اقلیتوں کی حیثیت وہیں تک قابل قبول ہے جس قدر اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ قانون کے تحت سائنس کی ہر کتاب کے پہلے باب میں مسلم سائنسدانوں کی عظیم کامیابیوں کی بات کی جاتی ہے۔

☆ جب بھی ضرورت پڑے تاریخ کو پوری آزادی کے ساتھ نئے سرے سے تحریر کیا جا سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر حقائق کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اسی بناء پر ضیاء دور کی نصابی کتب میں محمد علی جناح کو انتہائی پرہیزگار مسلمان کے طور پر پیش کیا جاتا رہا، 1965 کی جنگ بھارت نے شروع کی تھی اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی ایک ہندو سازش تھی۔ اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوئی ضرورت نہیں، اپنے نقص کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور اسی لئے ماضی کی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا جاتا۔

تعلیم کی تاریخ

1971 میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے ذوالفقار علی بھٹو کو قائل کر دیا کہ قومی سلامتی کے لئے قومی سکول نصاب ضروری ہے۔ 1974 میں پارلیمنٹ نے ایک ایکٹ کی منظوری دی جس کے تحت چاروں صوبوں کے لئے قومی نصاب پر چلنا لازم قرار دے دیا گیا۔ پینتیس سال بعد منظور ہونے والی اٹھارہویں آئینی ترمیم تک یہ ایکٹ نافذ رہا۔

بھٹو کے اس اقدام کی افادیت کا ادراک جنرل ضیاء الحق کو بھی جلد ہی ہو گیا۔ 1979 میں بھٹو کو پھانسی دینے کے بعد ضیاء نے پاکستان کو ایک نئی شناخت دینے کے لئے تعلیم کو استعمال کرنے کی ٹھان لی۔ 1981 میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو جاری کی گئی ایک ہدایت میں ضیاء الحق نے پاکستانی تعلیم کی ازسرنو تصور سازی اور ہر سطح کی تعلیم میں پاکستان کی تاریخ ازسرنو تحریر کرنے کا حکم دیا۔ یہ ایک سنگ میل تھا۔

اس کے بعد سے تحریک پاکستان کو ایک مسلم وطن کی خاطر فتحیاب جدوجہد

1. "Iftikhar A. Khan, "Describing Baloch as uncivilised in textbook irks Senators," DAWN March 12, 2016. Available at http://www.dawn.com/news/1245210

کے طور پر نہیں بلکہ اسلامی قانون کے مطابق ایک اسلامی ریاست کی خاطر چلائی جانے والی تحریک کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ تحریک پاکستان کے جو ہیروز یعنی محمد علی جناح، علامہ اقبال، سرسید احمد خان اصل میں راسخ العقیدہ مسلمان نہ تھے انہیں بھی اسی طرح ظاہر کیا جانے لگا۔

وزارت تعلیم کی ویب سائٹ پر آج بھی ضیاء الحق کی ان ترجیحات کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے: ''تعلیم وتربیت پاکستان کے شہریوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی زندگیاں اسلام کی تعلیمات کے مطابق اسی طرح گزار سکیں جس طرح قرآن وسنت میں طے کیا گیا ہے اور ایک سچے مسلمان کے طور پر ان کی تعلیم وتربیت کر سکیں''۔

یہ مقاصد غیر مسلم پاکستانیوں کے وجود کو نظر انداز کرتے ہیں۔ ان میں سماجی صفات کو فروغ دینے اور سماجی لحاظ سے ذمہ دار، سوچ بچار کرنے والے اور باخبر افراد تیار کرنے پر زور نہیں دیا جاتا۔ اور نہ ہی یہ تقاضا کرتے ہیں کہ لسانی وثقافتی لحاظ سے پاکستان کے تنوع کو تسلیم کیا جائے۔ شہریت کے بعض ناگزیر تقاضوں کا ان میں کوئی ذکر نہیں ملتا یعنی ملکی قانون کو جاننا اور اس کا احترام کرنا، ماحول کا تحفظ کرنا، حفظان صحت کی بنیادی باتیں، اپنے حصے کے ٹیکس ادا کرنا، سماجی انصاف کا یقین دلانا وغیرہ۔

حامیوں کا کہنا ہے کہ سچا مسلمان بن جانے سے کسی بھی طالب علم میں وہ تمام صفات خود بخود پیدا ہو جائیں گی جن کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ لہٰذا با اخلاق اور محب وطن پاکستانی تیار کرنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ لمبے چوڑے وعظ کئے جائیں اور سکول کے ماحول کو چھاؤنی نما بنا دیا جائے۔

شعبہ تعلیم کی اسٹیبلشمنٹ نصابی کتب کے ذریعے یہ سارے سبق سکھانے کی ضرورت کا دفاع کرتی ہے۔ ارباب اختیار اپنی نجی محفلوں میں کہتے ہیں کہ اگر بچوں کو سچ بتا دیا گیا تو کئی بچے پاکستان کی ضرورت اور اس کے وجود پر ہی سوال اٹھانے لگیں گے۔ 2003 میں پاکستان فلاسوفیکل کانگریس میں نصابی کتب کے ذریعے اس پروپیگنڈہ اور یہ سارے سبق سکھانے کے خلاف پیش کی گئی ایک قرارداد کو اس لئے شکست کا منہ دیکھنا پڑا کہ ''فلسفی'' بھی یہی مانتے ہیں کہ سچ بتانا خطرناک ہے۔

پاکستان کے مختلف وزرائے اعظم اس نقطہ نظر پر بین بین چلتے رہے یا اس سے متفق ہو گئے۔ 2002 سے 2004 کے دوران وزیر اعظم نے قرار دیا کہ ''نظریہ پاکستان وہ سب سے اہم چیز ہے جس کے بارے میں طلبہ کو جاننا چاہئے''۔ اعتدال پسند اسلام کی بات کرنے والے مذہبی علماء بھی پانچویں جماعت کے بعد اسلامیات متعارف کرانے کی ضرورت کا اظہار کر چکے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک اوائل عمری سے ہی رسمی تعلیم کے بغیر مذہبی تعلیم مذہبی اور فرقہ وارانہ انتہا پسند پیدا کرتی ہے۔ لیکن ایسے لوگ بھی ہمیشہ موجود رہے ہیں جو اس سے اتفاق نہیں کرتے جس کا اظہار ایک معروف پاکستانی ماہر معاشیات اور سابق وزیر اعظم ایک تعلیمی کانفرنس کی اختتامی تقریب کے دوران ان لفظوں میں کر چکے ہیں کہ

''مذہبی اور رسمی دونوں طرح کی تعلیم شروع سے ہی ضروری ہے۔ مذہبی تعلیم... کردار کی تعمیر میں مدد دیتی ہے''۔

نتائج واثرات

گیارہ ستمبر کے بعد جنرل مشرف کے یوٹرن نے پاکستان کو دفاعی سوچ رویہ اپنانے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ سامنے آیا کہ یورپ میں دہشت گردی کے کئی واقعات میں پاکستانی ملوث ہیں تو سب کی نظریں پاکستان کے تعلیمی نظام پر مرکوز ہو گئیں۔ دباؤ کے تحت حکومت نے پسپائی اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن مذہبی قوتوں کے مظاہروں نے بڑی کامیابی کے ساتھ اسے راستہ بدلنے سے روک لیا۔ اس وقت کے وزیر تعلیم نے تذبذب کے عالم میں ٹیلی وژن پر خود کو ہی بنیاد پرست قرار دے دیا اور اعلان کیا کہ نصابی کتب میں جہاد سے متعلق آیات دوبارہ شامل کر دی جائیں گی۔ [2]

1990 کی دہائی تک پاکستان کے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ریاست کی زیر سرپرستی عسکریت پسندی نوجوانوں کے ذہنوں پر گہرے اثرات مرتب کر چکی تھی۔ عسکریت پسند گروہ یونیورسٹیوں کے کیمپس میں کھلم کھلا پھرتے تھے، طلبہ کو کشمیر اور افغانستان میں جہاد کی دعوت دیتے تھے، جمعہ کی نمازوں میں چندے جمع کرتے اور سرحدوں سے ماورا جنگ کے اعلان کرتے تھے۔ گیارہ ستمبر کے بعد یہ لوگ زیر زمین چلے گئے۔ لیکن یہ محض ان کی وقتی تدبیر تھی۔

اب ذرا 2016 میں آ جاتے ہیں۔ ہر پاکستانی یونیورسٹی کا کیمپس پرہیزگاری کی زد میں ہے۔ جنوں، کالے جادو اور ماورائی قوتوں پر مباحثوں کی صورت میں بڑے بڑے مجمعے لگ رہے ہیں۔ ہر طرف داڑھیاں اور برقعے ہیں، تبدیلی مذہب کا پرچار کرنے والے گروہ کھلم کھلا سرگرم عمل ہیں اور مذہبی سوچ رکھنے والے اساتذہ کلاس کے وقت کے دوران آزادانہ اپنے عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ پرہیزگار لاتعداد وجوہات کے تحت مغرب پر سیخ پا ہیں اور اسی طرح انہیں یونیورسٹیوں میں لبرل خیالات بھی گوارہ نہیں جو ویلنٹائن ڈے منانے اور لڑکے لڑکیوں کو مل کر بیٹھنے کی اجازت دیتے ہیں۔ جس کی بس ہو جاتی ہے وہ بندوق اٹھا لیتا ہے۔

آج پاکستان شدید تذبذب کے عالم میں ہے۔ فوج اور حکومت انہی قوتوں سے نبرد آزما ہیں جن کی تخلیق میں انہوں نے مدد دی تھی۔ بھارت کے خلاف لڑی گئی جنگوں نے اتنے افسروں اور فوجیوں کی جانیں نہیں لیں جتنی مسلم دہشت گردوں کے خلاف لڑائی کی نذر ہو گئی ہیں۔ طالبان نے جب آرمی افسران کے 120 بچوں کو بے دردی سے تہ تیغ کیا تو پاکستانی شہروں میں بمشکل دو چار سو مظاہرین سڑکوں پر نکلے۔ لیکن پچھلے دنوں پنجاب کے سابق گورنر کے قاتل کی نماز جنازہ میں لوگوں کا ایک سمندر امڈ آیا جن کی تعداد کا اندازہ لاکھوں میں لگایا جاتا ہے۔

مستقبل قریب میں پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے شعبہ تعلیم میں پھیلے زہریلے مواد کو صاف کرنے کی کسی بھی کوشش کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کیونکہ جوابی ردعمل کے ڈر کے مارے وہ ایسا نہیں کریں گے۔ تعلیم کا شعبہ صوبوں کے حوالے کرنے سے بھی بات نہیں بنی۔ سچ تو یہ ہے کہ خیبر پختونخواہ کی نصابی کتب میں غازی علم دین[3] کی مدح سرائی میں شامل کئے گئے ایک نئے باب سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کام کتنا مشکل ہوگا۔ پاکستان کی سکیورٹی اسٹیبلشمنٹ نے تاحال وزیرستان میں دہشت گردوں کے ٹھکانوں پر فضاء سے بم گرانے پر ہی اکتفا کیا ہوا ہے اور مدارس کے معاملے میں پہلے کے مقابلے میں معمولی سی زیادہ چوکنا ہو گئی ہے۔ لیکن مدارس سے ہٹ کر عام تعلیمی اداروں کے طلبہ کے ذہنوں میں مذہب کا جو رس گھولا جا رہا ہے اس کے ہولناک خطرات کا ادراک نہ کیا گیا تو پاکستان اگلا عراق، شام یا افغانستان بن جائے گا۔

2. See Pervez Hoodbhoy, "Education Reform In Pakistan – Challenges and Prospects," (2006). Available at http://www.pc.gov.pk/vision2030/approach%20paper/t3/theme%203-Pervaiz%20Hudbouy-1.pdf
3. Ghazi Ilm-ud-din (4 December 1908 – 31 October 1929) was a Muslim who murdered a book publisher named Mahashe Rajpal for publishing the book Rangila Rasul, which offended religious sentiments of Muslims.

پرتشدد انتہا پسندی کے خلاف جنگ

آئی اے رحمان

سیکرٹری جنرل
ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان

پرتشدد انتہا پسند پاکستانی ریاست کے لئے دو طرح کی مشکلات پیدا کر رہے ہیں۔ ایک طرف مسلح گروہ قبائلی علاقہ جات پر ریاست کی عملداری کو چیلنج کر رہے ہیں۔ ریاست پر اپنا دباؤ بڑھانے کے لئے یہ عناصر پورے ملک میں سیکیورٹی فورسز اور عام شہریوں کے خلاف بھی حملے کر رہے ہیں اور بھاری جانی و مالی نقصان کا باعث بن رہے ہیں۔ دوسری جانب یہ عسکری انتہا پسند گروہ ریاست کے ساتھ لوگوں کی وفاداری کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش میں یہ الزام عائد کر رہے ہیں کہ یہ ریاست ان کے نزدیک اسلامی تعلیمات کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔

پاکستان میں مذہبی انتہا پسندی کی جڑیں لوگوں کے ان سیاسی تجربات میں ملتی ہیں جن سے وہ گزشتہ تین صدیوں سے گزر رہے ہیں۔ نوآبادیاتی طاقت کے غلبے کے جواب میں اپنی آزادی واپس لینے اور اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے انہوں نے دو حکمت عملیوں سے کام لیا۔ روایت پسند مسلم علماء نے زور دیا کہ مسلم قوم عقیدے، اتحاد اور یکجہتی کی اپنی بنیادی اقدار کی طرف واپس آئے، خلافت کے قیام کی جدوجہد کرے (جس کی تیاری کے لئے تھیوکریٹک ریاستیں بنائی جائیں) اور مسلح تحریک کے ذریعے کمیونٹی کے مقاصد کو عملی جامہ پہنائے۔

دوسری حکمت عملی ان لوگوں نے تیار کی جنہیں آپ جدیدیت پسند کہہ سکتے ہیں کہ سائنسی علوم کے حصول اور خودارادیت کا قانونی و آئینی راستہ اپناتے ہوئے اپنی آزادی اور وقار حاصل کریں۔ یہ گروپ لوگوں کو اپنے عقیدے کے ساتھ اپنی وابستگی برقرار رکھنے سے نہیں روکتا تھا لیکن اس کے نزدیک ایک طرف عقیدہ اور دوسری جانب لبرل اقدار کے احترام اور سائنسی علوم پر مبنی جمہوری و سماجی نظام کی خواہشات آپس میں متصادم نہ تھے۔ بلاشبہ مسلمانوں کے یہ نظریات، جو علامہ اقبال اور کئی دیگر شخصیات نے پیش کئے، اسی بات کا ادعا کرتے تھے کہ ان مقاصد کے حصول کی جستجو دراصل اسلام کے پاک اصولوں کی طرف واپسی کی جستجو ہے۔

تحریک پاکستان میں جدیدیت پسند ہی پیش پیش رہے اور نئی ریاست کے بانیوں کا اعزاز انہی لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن حصول پاکستان میں کامیابی کے ساتھ ہی یہ لوگ میدان اقتدار میں اپنے روایت پسند حریفوں کے دباؤ کا شکار ہو گئے جن کا کہنا تھا کہ پاکستان کی اصل یہی ہے کہ اسے صرف مذہبی تعلیمات کے مطابق ہی چلایا جا سکتا ہے۔ تاریخ پاکستان روایت پسندوں اور جدیدیت پسندوں کے درمیان اسی مسلسل کشمکش کی کہانی ہے۔

ایک طویل عرصے تک روایت پسند یہی سمجھتے رہے کہ آئین میں ان کے نقطہ نظر کو جگہ دینے کے منصوبے کی مخالفت ہو رہی ہے۔ لیکن ریاستی اشرافیہ نے آئین میں، قوانین میں اور عملی طور پر مراعات کی خاطر خود کو روایت پسندوں کے دباؤ سے دوچار کر دیا کیونکہ وہ لوگوں کی بنیادی ضروریات اور خواہشات پوری نہیں کر پائی تھی۔ تاہم جدیدیت پسندوں اور انہیں چیلنج کرنے والوں کے درمیان چپقلش 1970 کی دہائی کے اواخر تک تشدد سے پاک رہی جس کے بعد پاکستان کے انتہا پسند عناصر کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے پرتشدد طریقے اپنانے کے مواقع پیش کر دیئے گئے۔

افغان جہاد میں روایت پسند اقلیت کے کردار، بھاری رقوم اور جدید ترین ہتھیاروں تک رسائی کی بدولت یہ لوگ مسلح طریقے سے ریاست کو چیلنج کرنے لگے اور اپنے مسلح گروہوں کی پرورش کے لئے انہیں پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں حالات سب سے موزوں ملے۔

انتہا پسندوں نے ریاست کو چیلنج تو کر دیا لیکن اس کا ایک پیچیدہ پہلو یہ ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اپنے مقاصد کو باہم مربوط انداز میں بیان نہیں کیا۔ پہلے جب قبائلی عمائدین سے کہا گیا کہ وہ افغانستان میں سرگرم عسکریت پسند گروہوں کے میزبان نہ بنیں اور اپنی سرزمین کو ان سرگرمیوں کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہ دیں تو انہوں نے پاکستانی ریاست پر الزام عائد کر دیا کہ وہ ان کی روایتی خودمختاری کو پامال کر رہی ہے۔ پاکستان کے لئے عسکریت پسندوں کے مطالبات تسلیم کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ یہ ریاستی خودمختاری کے حقوق پر سمجھوتہ کرنے والی بات ہوتی۔

بعد میں ایک وقت آیا کہ عسکری انتہا پسندوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم پاکستان کو افغانستان میں اپنے دشمنوں کا ساتھ دینے اور ملک میں شریعت کی حکمرانی نافذ نہ کرنے کی سزا دے رہے ہیں۔ یہ دلیل بھی پاکستان نے قبول نہ کی کیونکہ ایک چھوٹی سی اقلیت یہ طے نہیں کر سکتی تھی کہ پاکستان کی پالیسی کیا ہونی چاہئے اور نہ ہی اسے لوگوں کی اتنی بڑی اکثریت پر اپنا امر مسلط کرنے کی اجازت دی جا سکتی تھی جو ان کے غلبے کو مسترد کرتے تھے۔

انتہا پسند پاکستانی آئین کے تحت رہنے پر تیار نہ ہوئے، پھر انہوں نے دفاعی تنصیبات پر حملے شروع کر دیئے یہاں تک کہ نوبت 2014 میں پشاور کے آرمی پبلک سکول پر حملے تک آ پہنچی جس میں 150 سے زائد طلبہ اور عملہ کے ارکان کا قتل عام کیا گیا۔ اس کے بعد حکومت پاکستان کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ قبائلی علاقہ جات کو تمام تشدد پسند گروہوں سے پاک کرنے کے لئے بھرپور کارروائی کرے۔ یہ مہم اب اپنی تکمیل کو پہنچنے والی ہے۔

دوسری جانب انتہا پسند اسلامی تعلیمات کی اپنی نت نئی تشریحات بھی دیتے چلے جا رہے ہیں۔ مذہبی ضابطے میں ان کی طرف سے متعارف کرائی گئی انتہائی ریڈیکل نوعیت کی تبدیلی جہاد سے متعلق ہے۔ کلاسیکی اسلامی قانون کی رو سے جہاد کی اجازت صرف ریاست دے سکتی ہے لیکن پاکستان میں سرگرم انتہا پسندوں نے مشرق وسطی میں اپنے ہم خیال بھائیوں کی طرح دعویٰ کر دیا کہ غیر ریاستی کرداروں کا کوئی بھی گروہ حتیٰ کہ افراد بھی جہاد کر سکتے ہیں۔ انتہا پسندوں کا متعارف کرایا ہوا ایک نیا آئیڈیا یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں لیکن اپنے عمل کے اعتبار سے مسلمان ہونے کے معیار پر پورا نہیں اترتے وہ گردن زنی کے مستحق ہیں اور یہ سزا کوئی بھی ''اچھا مسلمان'' یعنی کسی انتہا پسند گروہ کا کوئی رکن دے سکتا ہے۔

انتہا پسندوں کی جانب سے اس انتہائی جارحانہ اور یکسر عدم برداشت پر مبنی عقیدے کا پرچار ملک میں انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزیوں کا باعث بنا ہے۔ پاکستان کے سب سے بڑے اقلیتی مسلم فرقے اہل تشیع کو کافر قرار دیا جاتا ہے اور انہیں بڑی تعداد میں قتل کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے کوئٹہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جہاں ہزارہ شیعہ برادری کو مسلسل ہدف بنایا جا رہا ہے۔ صرف 2015 میں قبائلی علاقے کے بعد سب سے زیادہ تنازعات کا شکار علاقے بلوچستان میں تین طرح کی عسکریت پسند تنظیموں کے حملے دیکھنے میں آئے یعنی مذہبی عسکریت پسند نما، فرقہ ورانہ ٹارگٹ کلر اور قوم پرست ملیشیا۔ صوبے میں عسکریت پسندوں کے 280 حملے (تمام کیٹیگریز کے) ہو چکے ہیں جو کسی بھی

صوبے کے مقابلے میں زیادہ ہیں جن میں 355 افراد لقمہ اجل بن چکے ہیں۔ ضلع بولان میں ایک شیعہ مسجد کے باہر حملے میں گیارہ افراد کو قتل کر دیا گیا۔ نسلی وابستگی کی بناء پر ہونے والے تشدد نے صوبے کے مختلف علاقوں میں 51 غیر بلوچ کارکنوں کی جانیں لے لیں۔ علاوہ ازیں ملکی تاریخ میں پہلی بار پچھلے دنوں انتہاپسندوں نے شمالی علاقہ جات میں بسنے والے اسماعیلیوں کو بھی دھمکیاں دی ہیں۔

مذہبی اقلیتوں کے خلاف حملوں میں بھی اضافہ ہو گیا ہے۔ کم از کم 80 افراد کو اس وقت موت کی نیند سلا دیا گیا جب 2013 میں پشاور کے ایک چرچ میں ہونے والے اجتماع کو نشانہ بنایا گیا اور گزشتہ سال لاہور کی عیسائی کالونی یوحنا آباد میں دو گرجا گھروں پر بم حملوں میں 15 افراد زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ احمدیوں کو بھی ہدف بنا کر قتل کرنے کا سلسلہ بے روک ٹوک جاری ہے، ہندو بھی شکایت کرتے نظر آتے ہیں کہ ان کی بچیوں کو تبدیلی مذہب پر مجبور کرنے کے واقعات کی لہر آئی ہوئی ہے، قبائلی ایجنسی کے سکھ عسکریت پسندوں کے ہاتھوں پول ٹیکس کی زد میں ہیں اور کیلاش کے لوگوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں یا نتائج بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔

انتہاپسند خواتین کے بنیادی حقوق کو خاص طور پر بالکل برداشت نہیں کرتے۔ وہ لڑکیوں کے تعلیمی مراکز کو نشانہ بناتے ہیں اور سینکڑوں سکول تباہ کر چکے ہیں۔ ان کے قاتلانہ حملے سے زندہ بچ جانے والی ایک بچی ملالہ یوسف زئی بھلے نوبل انعام حاصل کر چکی ہے لیکن انتہاپسند آج بھی اس کے موقف کے خلاف فتوے دے رہے ہیں۔ دنیا بھر میں خواتین پر ان کے حملوں کی مذمت کی گئی ہے لیکن انتہاپسندوں کی صفوں میں پشیمانی اور افسوس کا شائبہ تک دکھائی نہیں دیتا۔

تنازعات کا شکار علاقوں میں انتہاپسندوں کی زیادتیاں اب وہاں سے نکل کر وسیع تر علاقوں میں پھیل رہی ہیں اور ملک کے سبھی علاقوں میں اقلیتی برادری اور فرقوں کے علاوہ خواتین کے لئے بھی بڑھتے خطرات دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ دوسری طرف دہشت گردی کے خطرے سے نمٹنے کے لئے جو اقدامات کئے جا رہے ہیں ان سے لوگوں کے بنیادی حقوق کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ گزشتہ چند سالوں میں نافذ کئے گئے خصوصی قوانین نے شہریوں کے قانونی استحقاق بالخصوص ضابطے کی قانونی کارروائی پر ان کے حق کو محدود کر دیا ہے۔ سزائے موت پر پابندی دسمبر 2014 میں اٹھا لی گئی اور اب تک 350 افراد کو پھانسی دی جا چکی ہے اور پہلے سے وحشت زدہ معاشرے کو مزید وحشت زدہ کیا جا رہا ہے۔

پاکستانی ریاست کو انتہاپسندی کے خلاف جنگ پر اربوں روپے خرچ کرنا پڑے۔ مصالحتی کوششوں کی ناکامی کے بعد آرمی کو ''ضرب عضب'' شروع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی جو انتہاپسندوں کو قبائلی علاقہ جات میں ان کے ٹھکانوں سے نکال باہر کرنے کی فوجی مہم کا نام ہے۔ کارروائیوں کے پیمانے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارہ ماہ پر محیط اس مہم کے دوران انتہاپسندوں کے 837 ٹھکانے تباہ کئے جا چکے ہیں اور 3,400 دہشت گردوں کے علاوہ 488 افسران اور جوان بھی موت کا شکار ہو چکے ہیں۔

ملکی وسائل بھی پرتشدد انتہاپسندوں کے پیدا کئے ہوئے خطرات سے نمٹنے کی کارروائیوں کی نذر ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے ملکی معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ حکومت کی طرف سے عمدہ مراعات کی پیشکشوں کے باوجود غیر ملکی سرمایہ کار سکیورٹی خدشات کے پیش نظر پاکستان آنے سے گریزاں ہیں۔ ملک ثقافت، فن، ادب اور کھیل جیسے شعبوں میں دوسرے ممالک کے ساتھ تبادلوں کے ثمرات سے محروم ہو رہا ہے۔ پاکستان ''پست انسانی ترقی والے ممالک'' کی کیٹیگری سے بھی باہر نہیں نکل پایا جہاں جنوبی ایشیائی ممالک میں سے دوسرا ملک صرف افغانستان اس کے ساتھ ہے۔

ریاست کے لئے انتہاپسندوں کے خطرے کا ایک ناگزیر ضمنی اثر یہ ہے کہ روزمرہ امور میں شہریوں کا تشدد پر انحصار بڑھ رہا ہے۔ گروہوں اور افراد کے درمیان چاہے مسائل چھوٹے موٹے ہی کیوں نہ ہوں، اختلافات کو بات چیت کے ذریعے حل کرنے کی گنجائش سکڑ رہی ہے اور لوگوں کی بڑی تعداد یہی سمجھتی ہے کہ اولین راستہ ہی تشدد ہے۔ ان سب باتوں سے اور کچھ ہو نہ ہو معاشرے میں امن اور قانون کی حکمرانی برقرار رکھنے کے اخراجات ضرور بڑھ جاتے ہیں۔

آپریشن ضرب عضب کو ملنے والی بھرپور عوامی حمایت سے یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت انتہاپسندوں کے اس خودساختہ فریضے کو مسترد کرتی ہے کہ پاکستان کے آئینی ڈھانچے کو تباہ کیا جائے اور مسلمانوں کے عقیدے کو اپنی جانبدارانہ خواہشات کے مطابق ازسرنو تحریر کیا جائے۔ لوگ اگر فوجی کارروائی کی پوری تائید کرتے ہیں تو اس میں یہ حقیقت بھی اپنا کردار ادا کرتی ہے کہ یہ انتہاپسندوں کو آئین کے اندر رہتے ہوئے مصالحت کی راہ پر لانے کی تمام کوششیں کر لینے کے بعد ہی شروع کیا گیا۔

تاہم ملک میں اس بات پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے کہ جہاں پرتشدد انتہاپسندوں سے طاقت کے ذریعے نمٹنا ضروری ہے وہیں خطرہ اس وقت تک ختم نہیں ہو گا جب تک کہ ذہنوں کی جنگ میں بھی انہیں شکست نہیں ہو جاتی۔ اس حقیقت سے ریاست کی آگاہی دہشت گردی کے خاتمے کے لئے اپنائے جانے والے 20 نکاتی نیشنل ایکشن پلان کے بعض مقاصد سے عیاں ہے۔ اس میں مذہب کے نام پر اذیت کے خلاف موثر اقدامات کرنے کے فیصلے، مدارس کی رجسٹریشن و ریگولیشن، اخبارات اور ٹی وی چینلز پر دہشت گردی کو دلیری سے تعبیر کرنے پر پابندی، فاٹا میں انتظامی و ترقیاتی اصلاحات جن میں عارضی بے گھر افراد (ٹی ڈی پیز) کی واپسی پر زور دیا گیا ہے، بیگانگی کا شکار تمام گروہوں کے ساتھ سیاسی مفاہمت یقینی بنانے کے لئے بلوچستان حکومت کو بااختیار بنانے اور فوجداری نظام انصاف کی مکمل طور پر تشکیل نو و اصلاح سے متعلق نکات شامل ہیں۔

ظاہر ہے انتظامیہ اور انصاف کے نظاموں کی عدم فعالی کی وجہ سے انتہاپسندوں نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کر لی ہے انہیں تبھی اس سے محروم کیا جا سکتا ہے کہ عوام کے نزدیک بنیادی اہمیت کے حامل ان شعبوں میں ریاستی اداروں کی کارکردگی بہتر ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی علماء کو بھی اس بات کا احساس کرنا چاہئے کہ ان کے عقیدے کو ان خودساختہ منصفوں سے خطرہ ہے جو بلا ضرورت، بلا اجازت اور بے دریغ اپنے انداز میں اس کی تشریحات میں لگے ہوئے ہیں۔ مذہبی بحثوں میں انتہاپسندوں نے اپنے لئے جو جگہ پیدا کر لی ہے اسے واپس لینے کے لئے اسلام کے اولین اصولوں کی پرامن اور لبرل نوعیت کو اجاگر کرنا ہو گا۔

کٹر انتہاپسندوں کو یہ خطرناک اور اپنے ہاتھوں اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والے اس راستے سے باز رکھنا آسان نہیں ہو گا لیکن عام لوگوں بالخصوص نوجوانوں کو تشدد کی راہ سے دور رکھنے کا کام ناممکن نہیں ہونا چاہئے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کو عسکریت پسند گروہوں میں شامل ہونے سے روکنے اور ایسے عسکریت پسندوں کو جنہیں واپس لایا جا سکتا ہو، واپس لانے کے لئے ایک وسیع البنیاد پروگرام پر کام کیا جائے۔

سکول نصاب میں بڑی تبدیلیاں اپنی جگہ، ضرورت یہ بھی ہے کہ تحقیق کی بنیاد پر اسلام کی لبرل اقدار کو دنیا بھر میں فروغ دیا جائے تا کہ انتہاپسندی کے نظریاتی ایوانوں کو چیلنج کیا جا سکے۔ سابق عسکریت پسندوں کو ریڈیکلائزیشن سے پاک کرنے کے پراجیکٹ کو آگے بڑھانا ہو گا کیونکہ اب تک جو کچھ کیا گیا ہے وہ محض محدود اور کسی حد تک بے ثمر تجربات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نوعیت کے پروگراموں پر سری لنکا، چین اور سعودی عرب جیسے ملکوں سے رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مذہبی اداروں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کی بڑھتی تعداد کو زندگی کے مختلف شعبوں میں تیزی سے کھپانے کے لئے بھی گنجائش پیدا کرنا ہو گی اور یوں یقینی بنانا ہو گا کہ پرتشدد عسکریت پسندی ہی ان کے پاس واحد راستہ نہ رہ جائے۔

دہشت گردی کے لئے سرمایہ کی فراہمی اور خیرات پر تشدد انتہا پسندی کے خاتمہ کے لئے حکومت پاکستان کی کاوشیں

عثمان ظفر
ریسرچ اینڈ کمپیئنز منیجر
پاکستان پیس کلیکٹو
(وفاقی وزارت اطلاعات، نشریات وقومی ورثہ کا ابلاغی منصوبہ)

دہشت گردی اور انتہا پسندی ایک انتہائی پیچیدہ موضوع ہے۔ یہاں تک کہ آج کے اس دور میں بھی ریاستوں کو اس لعنت کی تشریح کرتے ہوئے ناقابل یقین حد تک مشکل پیش آتی ہے۔ اس کی کئی طرح کی وجوہات ہیں، جیسے کس نوعیت کی سرگرمی کو دہشت گردی کی کارروائی قرار دیا جاسکتا ہے، اس کے ذمہ دار گروہوں کی تعریف کیا ہوگی، پرتشدد انتہا پسندی کی وہ خاص نوعیت جس سے کوئی قوم دوچار ہو۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس پر ریاستوں کے جوابی اقدام میں مسلسل تبدیلی آتی رہتی ہے، نئے اور زیادہ موثر قوانین بنائے جاتے ہیں، وسیع پیمانے پر اور ہدف پر مبنی دونوں طرح کی فوجی کارروائیاں کی جاتی ہیں، اس خطرے سے نمٹنے کے لئے سیاسی اتفاق رائے پیدا کیا جاتا ہے، وغیرہ۔ پاکستان کے لئے بھی یہ کوئی انوکھی بات نہیں جو گیارہ ستمبر کے بعد سالہا سال سے پرتشدد انتہا پسندی کی کبھی ایک تو کبھی دوسری شکل سے نبرد آزما ہے۔

ملک میں عسکریت پسندی کے ہر لحہ بدلتے ان محرکین کے پیش نظر پاکستان میں پرتشدد انتہا پسندی پر پالیسی سازی روز اول سے ہی ایک پیچیدہ عمل رہا ہے جس کے لئے صحیح معنوں میں ریاستی مشینری کے ہر رخ کا حصہ شامل کرنا ضروری ہے اور اسے محض دو چار لوگوں کے ذاتی تجزیوں پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔

ایک اہم ترین پہلو جو اس وقت ریاست کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے، یہ مسئلہ ہے کہ دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیموں کو فنڈز کیسے ملتے ہیں۔ نیشنل ایکشن پلان کا ایک اہم ترین پہلو دہشت گردوں کو ملنے والے سرمایہ کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے ''دہشت گردوں اور دہشت گرد تنظیموں کو سرمایہ کی فراہمی روکنا'' تھا۔ اس ضمن میں متعدد اقدامات کئے گئے ہیں لیکن ایک عنصر جو مزید توجہ کا متقاضی ہے، وہ ان گروہوں کی طرف سے لوگوں کی سخاوت اور خیرات کا غلط استعمال ہے۔ خیرات کے بارے میں سامنے آیا ہے کہ یہ دہشت گردی اور انتہا پسندانہ سرگرمیوں کے لئے آمدنی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ دہشت گرد اور انتہا پسند گروہ خیرات وعطیات لینے کے لئے لوگوں کے مذہبی جذبات اور مذہبی ذمہ داری کی آڑ لیتے ہیں۔ یہاں اس امر کا اعادہ ضروری ہے کہ عوام دانستہ طور پر ان گروہوں کو رقم نہیں دیتے بلکہ نادانستہ طور پر ان کی رقم ایسے گروہوں کے پاس پہنچ جاتی ہے حالانکہ ان کی نیت نیک ہوتی ہے کیونکہ وہ دہشت گردی کے لئے استعمال ہونے والے سرمایے اور خیرات کے درمیان کسی ممکنہ تعلق کے بارے میں پوری آگاہی نہیں رکھتے۔

وزارت اطلاعات، نشریات وقومی ورثہ اس خطرے کی نشاندہی کر چکی ہے اور اسی بناء پر پاکستان میں خیرات دینے کے رجحانات اور رویوں سے متعلق پہلوؤں کو سمجھنے، مداخلت کے اہم شعبوں کے تجزیہ اور ایک ایسی مہم تیار کرنے کے لئے متعدد سرگرمیوں کا آغاز کیا گیا ہے جس کے ذریعے اس مسئلے کے حوالے سے عوام کو براہ راست مخاطب کیا جاسکے۔

خیرات دینے کے رجحان پر تحقیق

اس سرگرمی کا پہلا قدم یہ تھا کہ پاکستان میں خیرات دینے کے رجحان اور رویوں پر تحقیق کی جائے۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ اس حوالے سے لوگوں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کے لئے اس سے پہلے کوئی ایسی جامع تحقیقی کاوش نہیں کی گئی جس میں اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہو کہ پاکستان میں لوگ کیوں یا کیسے خیرات دیتے ہیں۔ سوائے چند ایک تحقیقی کاوشوں کے جن کا دائرہ محدود سا تھا، اس موضوع پر کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی۔ یہ بات خاص طور پر پریشان کن تھی کیونکہ ہر سال پاکستان میں خیرات، عطیات اور چندے کی صورت میں اصل اور بعض مشکوک دونوں طرح کی تنظیمیں اربوں روپے جمع کرتی ہیں۔

Figure 1: Do you personally give donation/charity?

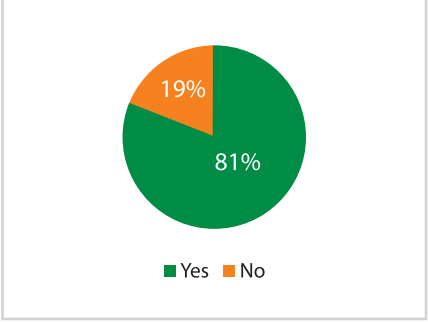

اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے وفاقی وزارت اطلاعات ونشریات نے ایک ملک گیر تحقیقی کاوش کے تحت اس رجحان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ اس تحقیقی کاوش کا مقصد نہ صرف اس بات کا جائزہ لینا تھا کہ کتنی رقم دہشت گرد تنظیموں کو جاتی ہے بلکہ دہشت گردوں کو سرمایہ کی فراہمی کے مسئلے سے متعلق علم میں پائے جانے والے خلاء کا اندازہ بھی لگانا تھا تاکہ ان معلومات کو بروئے کار لاتے ہوئے وزارت اطلاعات اس مسئلے پر ایک آگاہی مہم تیار کرسکے۔

اس تحقیقی کاوش کے لئے ایک ایسا طریقہ کار اپنایا گیا جس کے ذریعے قومی سطح پر دہشت گردی اور انتہا پسندی کی پرتشدد کارروائیوں پر عوام کے علم وخیالات کے بارے میں قومی سطح کا ڈیٹا حاصل کیا جاسکے۔ جغرافیائی لحاظ سے اس میں ملک کے سبھی صوبوں کے علاوہ آزاد جموں وکشمیر، وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا) اور گلگت بلتستان کی شہری ودیہی دونوں طرح کی آبادی والے بڑے حصوں کو شامل کیا گیا۔ ڈیٹا جمع کرنے کے لئے ماہرین کی زیر نگرانی سوالنامے کی بنیاد پر لوگوں کے انٹرویو کئے گئے۔ فیلڈ ورک مئی سے جون 2015 کے دوران کیا گیا۔ اس مقصد کے لئے کسی ترتیب کے بغیر نمونے کے طور پر لئے گئے 5500 افراد کے انٹرویو کئے گئے۔

خیرات دینے کے طریقے: تحقیق سے حاصل ہونے والی معلومات

سروے میں حصہ لینے والے 81 فیصد افراد کا کہنا تھا کہ وہ کسی نہ کسی شکل میں خیرات دیتے ہیں اور ان کی اکثریت پیسوں کی شکل میں عطیات دیتی ہے۔

پاکستانیوں کی بھرپور مذہبی خاصیت کے پیش نظر یہ امر ناگزیر تھا کہ مذہبی پہلو عطیات کے پیچھے محرکات کے تعین میں اہم کردار ادا کریں گے۔ زکوٰۃ اسلام کا ایک بنیادی ستون ہے اور جس شخص پر زکوٰۃ بنتی ہو اس کے لئے ایک باقاعدہ ضابطے کے تحت اس کی ادائیگی کرنا لازم ہے۔ خیرات

Figure 2: Donation/charity Form

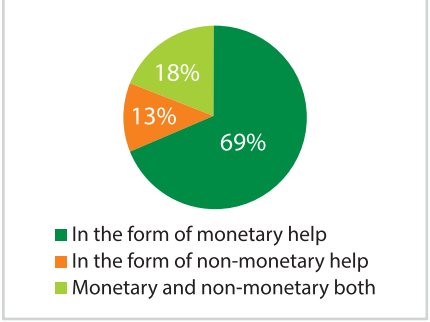

Figure 3: Donation/Charity heads (Multiple responses)

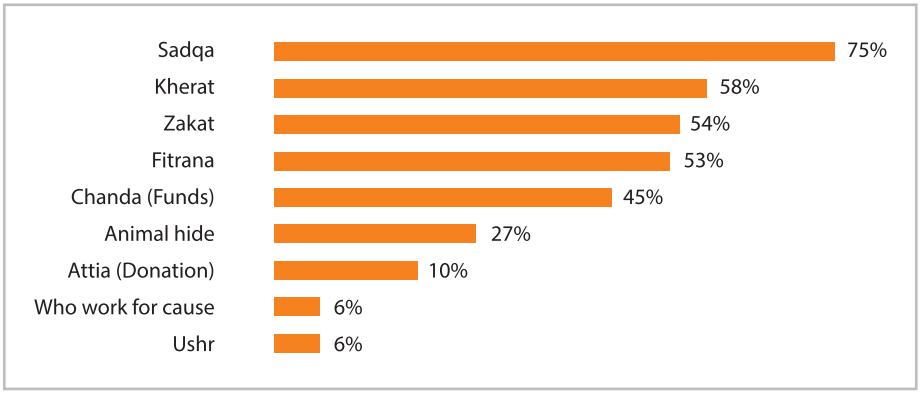

کی صورت میں مذہب کے اظہار کو نہ صرف مذہب کے ساتھ وابستگی کے اہم اشاریئے کے طور پر لیا گیا بلکہ اس سے یہ مطلب بھی لیا گیا کہ کوئی شخص اپنے طے شدہ فرائض کی ادائیگی کس قدر لگن کے ساتھ کرتا ہے۔

سروے میں حصہ لینے والے افراد میں خیرات دینے کے مروجہ طریقوں کے اشاریوں کے مطالعہ سے یہ نتائج سامنے آئے کہ نمونے میں شامل افراد میں سے تقریباً 72 فیصد ماہ رمضان (جس کے دوران مسلمان روزے رکھتے ہیں)، 47 فیصد عید کے موقع پر (مسلمانوں کا مذہبی تہوار) اور 53 فیصد ہر مہینے دیتے ہیں (شکل 3)۔ خیرات کی نوعیت میں بھی مذہب سے متعلق پہلو اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سروے کے مطابق 75 فیصد صدقہ کی شکل میں اور 54 فیصد زکوٰۃ کی شکل میں خیرات دیتے ہیں (شکل 2)۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خیرات دینے کے معاملے میں مضبوط مذہبی جذبات سب سے اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سروے میں خیرات سے مستفید ہونے والوں کا احاطہ بھی کیا گیا جن میں مساجد، معروف سماجی فلاحی اداروں اور مدارس کو سب سے زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔

خیرات اور مذہبی جذبات کے آپس میں یوں جڑے ہونے کے باعث خیرات وعطیات کے تواتر کے معاملے میں سامنے آیا کہ لوگ اکثر اور مسلسل دیتے ہیں۔ تقریباً 53 فیصد افراد نے اپنے متعدد جوابات میں بتایا کہ وہ مذہبی مواقع پر دیئے جانے والے عطیات سے ہٹ کر کم وبیش مہینے میں ایک بار خیرات دیتے ہیں۔

خیرات کی رقم 100 پاکستانی روپے سے 5000 پاکستانی روپے تک رہی جبکہ عطیات کی رقم اس سے زیادہ تھی (شکل 4)۔ اگرچہ سروے میں حصہ لینے والے صرف دو فیصد افراد کا کہنا تھا کہ وہ زیادہ رقم کے عطیات دیتے ہیں لیکن 21 فیصد نے سوال میں دیئے گئے رینگ سکیل میں خیرات کے طور پر دی جانے والی رقم ظاہر نہیں کی۔

ذاتی نوعیت کی فلاحی سرگرمیوں سے اس قدر بھاری رقوم جمع ہونے کے باوجود ایسے لوگوں کی تعداد برائے نام سی ہے جو اپنی دی ہوئی خیرات کے تصرف کے بارے میں کوئی باز پرس کرتے ہیں۔ سروے میں حصہ لینے والے صرف 48 فیصد افراد نے بتایا کہ وہ پوری طرح جانتے ہیں کہ ان کی خیرات کہاں جا رہی ہے، 26 فیصد کو اس بارے میں کوئی اندازہ نہ تھا (شکل 5)، جبکہ باقی افراد کا کہنا تھا کہ اس بارے میں کہ ان کی رقم کہاں جاتی ہے، ان کی معلومات یا تو محدود ہیں یا پھر بالکل بھی نہیں ہیں۔ یہ بات خاص طور پر پریشان کن ہے کیونکہ حالیہ سالوں میں کئی ایسے واقعات سامنے آ چکے ہیں جن میں عسکریت پسند گروہوں نے پاکستان میں دہشت گردی کی سرگرمیوں کے فنڈز فراہم کرنے کے لئے مشکوک خیراتی تنظیمیں قائم کیں۔

مزید کریدنے پر پتہ چلا کہ سروے میں حصہ لینے والے صرف دو فیصد افراد یہ جانتے تھے کہ دہشت گرد گروہ ان کی دی ہوئی خیرات کی رقم کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس پر ضروری ہو جاتا ہے کہ حکومت خیرات کے طور پر دی جانے والی رقوم کے دہشت گردی کے لئے ممکنہ استعمال پر لوگوں میں شعور وآگاہی پیدا کرے۔ یہ اس امکان کے پیش نظر بھی ضروری ہے کہ دہشت گرد گروہ مالی عطیات کا ایک بڑا حصہ اپنی سرگرمیوں کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اس کا پوری طرح تعین نہیں ہو پایا لیکن پھر بھی حکومت کے لئے یہ شدید تشویش کی بات ہے جس پر اسے اقدامات کرنے چاہئیں۔

''حق، حقدار تک''، دہشت گردی کے لئے استعمال ہونے والے سرمایہ پر آگاہی مہم

اس تحقیقی کاوش نے اس بات کی نشاندہی میں اہم کردار ادا کیا کہ خیراتی رقوم کے دہشت گردی کے لئے استعمال پر لوگوں میں علم کا ایک بڑا خلاء پایا جاتا ہے۔ اس بناء پر وزارت اطلاعات ونشریات نے اس مسئلے سے نمٹنے کے لئے فیصلہ کیا کہ میڈیا پر ایک عوامی آگاہی مہم چلائی جائے جس کے ذریعے لوگوں میں شعور وآگاہی پیدا کی جائے کہ دہشت گرد خیرات کی رقوم کو کس طرح غلط طور پر استعمال کر سکتے ہیں اور لوگوں میں اس رجحان کو فروغ دیا جائے کہ وہ ایسی سرگرمیوں پر نظر رکھیں۔

اس ضمن میں وزارت اطلاعات ونشریات نے ''حق، حقدار تک'' کے عنوان سے ایک ملک گیر مہم کا آغاز کیا۔ یہ مہم تین بنیادی مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے تیار کی گئی:

- ☆ ایسی مشکوک خیراتی تنظیموں کو فنڈز فراہم کرنے کے خطرات پر عوامی آگاہی بہتر بنائی جائے جو عسکریت پسند گروہوں پر سرمایہ لگا رہی ہوں۔
- ☆ لوگوں کو اس بارے میں چوکنا کیا جائے کہ وہ خیرات دیتے وقت اس بات کو یقینی بنائیں کہ ان کی خیرات غلط ہاتھوں میں نہ جائے۔
- ☆ قابل احترام، تسلیم شدہ اور معتبر خیراتی تنظیموں کو عطیات دینے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

اس مہم کے سلسلے میں میڈیا کے ہر طرح کے ذرائع سے مدد لی گئی۔ ٹی وی اشتہار کی شکل میں ایک ''وائٹ بورڈ اینیمیشن'' اور پھر مختصر دورانیے کی دستاویزی فلمیں تیار کی گئیں جنہیں عوامی آگاہی پیغامات کی شکل میں متعدد سرکاری ونجی ٹی وی چینلز پر نشر کیا گیا۔ اس مہم کے ساتھ سوشل میڈیا پر اور آن لائن بھی مختلف سرگرمیاں کی گئیں اور اس کی ایک ویب سائٹ (http://haqdaar.gov.pk) اور فیس بک پیج (http://facebook.com/haqdaar) بھی تیار کیا گیا۔ ملک بھر کے متعدد شہروں میں خاص طور پر نوجوانوں اور کاروباری برادری کے لئے ضلعی سطح پر جامع سرگرمیوں کے ذریعے نچلی سطح کے لوگوں کو بھی اس مہم کا حصہ بنایا گیا۔

حق، حقدار تک: مہم کے اثرات کا تجزیہ

مہم کے اثرات کا جائزہ لینے کے لئے عددی طریقہ اپناتے ہوئے ایک مطالعاتی تحقیق کی گئی۔ حاصل ہونے والی معلومات کے مطابق 31 فیصد پاکستانیوں تک کسی نہ کسی شکل میں اس مہم کا پیغام پہنچا۔ ان شرکاء سے دہشت گردی پر لگنے والے سرمایے اور خیرات پر ان کے رویوں اور خیالات کے حوالے سے مزید سوالات کے ذریعے اس بات کا تجزیہ کیا

Figure 4: Occasions for donation/charity (Multiple responses)

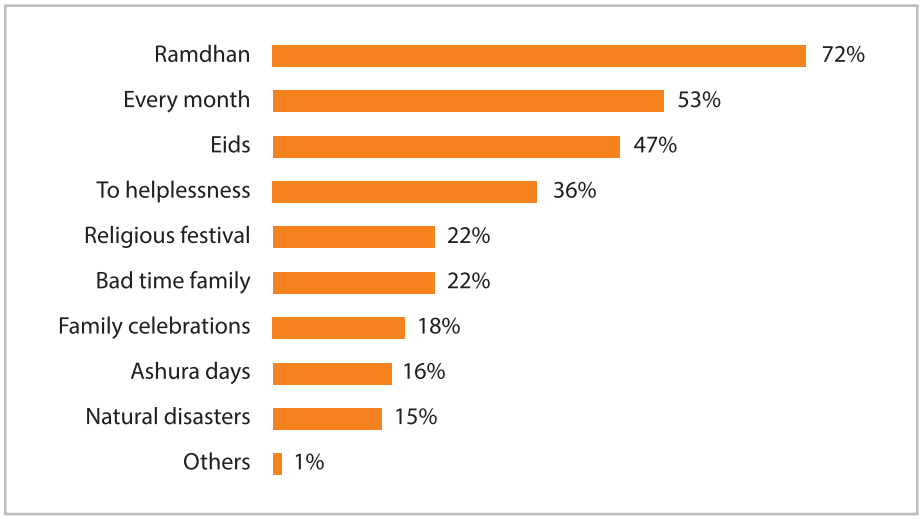

Figure 5: Awareness on how donations are spent by charity organizations

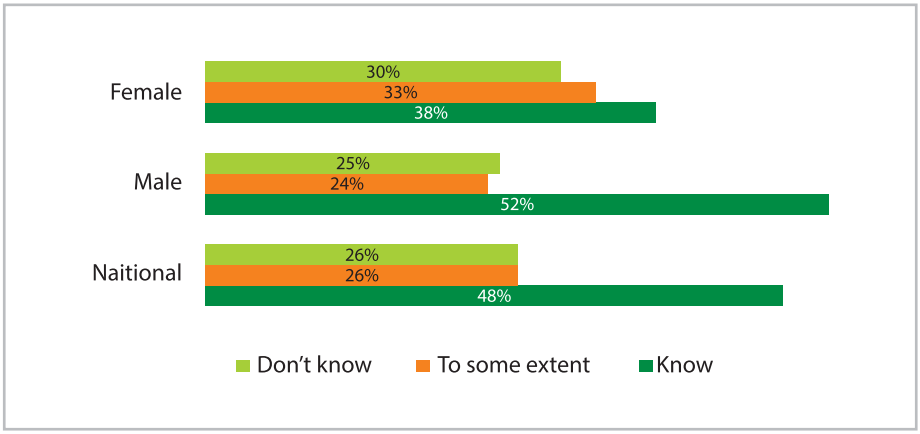

گیا کہ آیا اس مہم کی بدولت اس موضوع پر ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔

اس تحقیق سے سامنے آیا کہ وہ شرکاء جن تک اس مہم کا پیغام پہنچا، ان میں سے 33 فیصد کو خیرات کی رقم دہشت گردی کے لئے استعمال ہونے کے خدشے سے آگاہی ہوئی جو قومی اوسط سے کہیں بلند ہے۔ تحقیق سے یہ بھی پتہ چلا کہ شرکاء کے نزدیک اس مہم اور اس کے پیغامات کو بہت زیادہ تائید ملی اور ان کے نزدیک یہ پسندیدہ اور قابل اعتبار رہے۔

نتائج سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ اس مسئلے کے بارے میں شرکاء کی سمجھ بوجھ میں شاندار اضافہ ہوا اور آئندہ انہوں نے اس بارے میں چوکنا رہنے کا پختہ عزم کرلیا۔ 76 فیصد شرکاء کا کہنا تھا کہ اس مہم کی بدولت انہوں نے خیرات دینے کے بارے میں اپنے خیالات پر نظر ثانی کی۔ شرکاء کی ایک وسیع اکثریت کے مطابق اس مہم سے ان کی آگاہی کی سطح میں اضافہ ہوا۔

پیغام کی وصولی کی اعتبار سے اس مہم کے مجموعی نتائج انتہائی مثبت رہے۔ نتیجتاً وفاقی وزارت اس سال یہ مہم دوبارہ چلا رہی ہے جس کا ہدف 2016 کا ماہ رمضان ہوگا کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب پاکستانیوں کی اکثریت ضرورت مندوں کو عطیات دیتی ہے۔ اس تسلسل کو برقرار رکھنا مہم کے اثرات کو دیرپا بنانے کے لئے انتہائی ناگزیر ہے۔

حاصل بحث

دہشت گردی سے نمٹنے کے لئے محض فوجی کارروائی کافی نہیں۔ اس کے لئے ہمیں اس سوچ کا ازالہ کرنا ہوگا جو نفرت بھرے جذبات کے لئے زمین کو زرخیز بناتی ہے اور کچے ذہنوں پر اپنے نقوش چھوڑتی ہے۔ لہٰذا

Figure 6: Liking and credibility of campaign message (HHT exposed participants only)

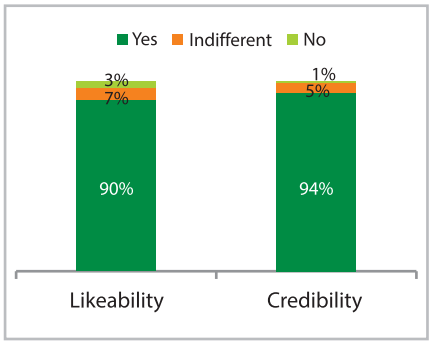

پرتشدد انتہاپسندی سے نمٹنے کے لئے صرف گولہ بارود ہی کافی نہیں بلکہ لفظوں کو بھی اس میں اپنا اثر دکھانا ہے۔ اس شعبے میں ابلاغ کی اہمیت کو قطعاً نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ وزارت اطلاعات، نشریات وقومی ورثہ نے پہلا قدم بڑھاتے ہوئے پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی کے خلاف پہلی بڑی ابلاغی مہم چلائی ہے جو دہشت گردی کے لئے سرمایے کی فراہمی سے نمٹنے کے لئے پہلی ملک گیر کاوش ہے۔

خیرات دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے مذہبی رجحان ہمارے ہاں ایک کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ معتبر خیراتی تنظیموں، جن میں مذہبی نوعیت کی تنظیمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، کی بڑی اکثریت اور سماجی بہبود کے لئے ان کے بے پناہ عطیات کو ایسی سرگرمیوں کی وجہ سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ حکومت اس حوالے سے سلسلہ وار اقدامات کر رہی ہے اور دہشت گردی کے لئے سرمایے کی روک تھام کو نیشنل ایکشن پلان کے ایک اہم ترین رخ کی حیثیت دیتی ہے۔ تاہم حکومت کے لئے یہ امر بھی ناگزیر ہے کہ وہ دہشت گردی پر لگنے والے سرمایے کے بارے میں عوام میں شعور و آگاہی پیدا کرے۔ ''حق حقدار تک'' جیسی مہم اس طویل سفر کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس مہم سے ثابت ہوگیا ہے کہ دہشت گردی اور انتہاپسندی کے خلاف جنگ میں حکومت اور عوام کے درمیان ایک اہم پل کا کردار ادا کرنے والی ایسی مہمات بہت ضروری ہیں۔

یہ بات بھی ناگزیر ہے کہ ایسی مہمات کو محض الگ تھلگ حیثیت میں نہ دیکھا جائے یا الگ تھلگ حیثیت میں نہ چلایا جائے۔ دہشت گردی اور انتہاپسندی پر عوام کی سمجھ بوجھ اور جوابی کارروائیوں میں پائی جانے والی اہم کمیوں اور پرخطر پہلوؤں کے جائزہ کے لئے مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس نوعیت کی تحقیقی سرگرمیاں صرف حکومت کو ہی نہیں بلکہ تحقیقی اداروں، تھنک ٹینکوں اور سول سوسائٹی تنظیموں کو بھی کرنی چاہئیں۔ اس تحقیق سے استفادہ کرتے ہوئے ریاست بالخصوص حکومت پاکستان پورے اعتماد کے ساتھ اپنے کردار میں بہتری لاسکتی ہے اور دوطرفہ ابلاغی طریقوں سے پارٹنرشپس کی ترویج کے لئے عوام کا اعتماد حاصل کرتے ہوئے عوامی حمایت کو پرتشدد انتہاپسندی، اس کے پس پردہ کرداروں اور حامیوں کے خلاف بروئے کار لاسکتی ہے۔

Figure 7: Perception of campaign messages (HHT exposed participants only)

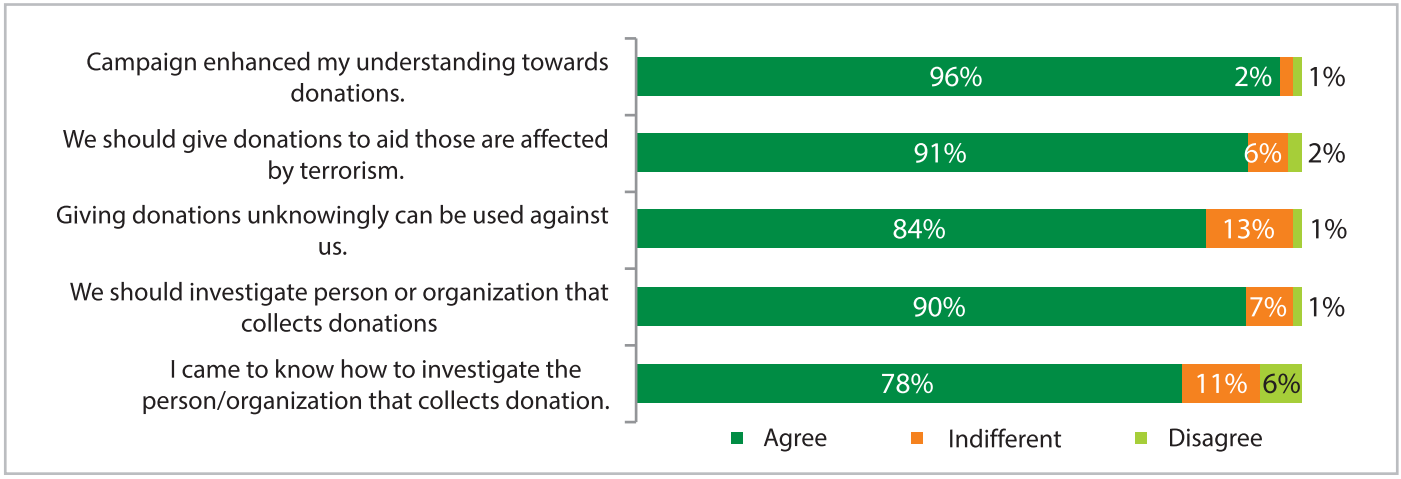

انٹرویو

جسٹس علی نواز چوہان

چیئرمین

نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس (این سی ایچ آر)

پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی کے بنیادی محرکین کیا ہیں؟

قیام پاکستان کے ساتھ ہی تقسیم کے دوران تشدد کا سلسلہ چل نکلا اور تاریخ گواہ ہے کہ نقل مکانی کی اس لہر میں لاتعداد لوگ اپنی زندگیوں اور حقوق سے محروم ہوئے اور بڑے پیمانے پر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہوئیں۔ اس کے بعد کئی لیڈر آئے جنہوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی اور سسٹم کو اپنے اپنے نظریات کے رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس دوران انہوں نے نظریہ پاکستان کو فراموش کر دیا جو اصل میں قائد کے اصولوں کی روشنی میں تشکیل دیا گیا تھا۔ ایسی ہی ایک مثال 1977 میں اس وقت دیکھنے کو ملی جب ذوالفقار علی بھٹو نے اقتدار سنبھالا اور سعودی عرب کے روایتی قوانین کو یہاں نافذ کرنے کی کوشش کی حالانکہ یہ پاکستان کی اصل ثقافت سے ہرگز ہم آہنگ نہ تھے۔ نظریات کی تشریح پر بار بار کے اس تصادم نے ملک میں پرتشدد انتہاپسندی کے لئے راہ ہموار کر دی۔

اپنے قومی / بین الاقوامی تجربے و مہارت کی بنیاد پر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے کون کون سے اقدامات ہونے چاہئیں؟ کیا پاکستان میں اس وقت پرتشدد انتہاپسندی کے حوالے سے کوئی قانونی طریقے / پالیسیاں رائج ہیں؟ اگر ہاں تو کیا کوئی ایسی مثالیں / واقعات ہیں جن سے ان کی افادیت ظاہر ہوتی ہو؟

بدقسمتی سے ہم کسی طرح کی قرون وسطی والی سوچ میں الجھے ہوئے ہیں جو ہر قسم کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ انسانی حقوق کو فاشزم اور فاشی کے برابر رکھا جاتا ہے۔ نظریات کے اس تصادم کو ٹھیک کرنا ہوگا۔ آئین میں جو قوانین طے کئے گئے ہیں انہیں آئین کے مرکزی شعبے میں بھی لانا ہوگا تاکہ ان کے ساتھ انصاف کیا جا سکے اور قرارداد مقاصد پر عملدرآمد کو ایک باقاعدہ شکل دینے کی ضرورت ہے۔

سب کے لئے ایک نصاب وضع کرنا ضروری ہے جس میں مدارس بھی شامل ہیں جو مذہبی تعلیم کے مراکز ہیں۔ حکومت نے نوجوانوں کی استعداد کو بروئے کار لانے میں کوتاہی برتی ہے اور یہی نوجوان ہیں جو انتہاپسندی کی راہ پر بھٹک رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں پوری اہمیت دی جائے اور ان کی اصلاح کی جائے۔ سول سوسائٹی بین الاقوامی برادری کے ساتھ مل کر پاکستان میں انسانی حقوق کو ترویج اور دوام دینے کے لئے شاندار خدمات انجام دے رہی ہے۔

آپ کے نزدیک انتہاپسندی کے تدارک میں نیشنل کمیشن فار ہیومن رائٹس (این ایچ سی آر) کا کردار کیا ہے؟

ایڈووکیسی اور تنازعات کے تصفیہ جیسی سرگرمیوں کے ذریعے کمیشن کا مقصد یہ ہے کہ 'ابہا' کے تصور کو آگے لایا جائے یعنی ایسے جدید قوانین متعارف کرائے جائیں جو اسلام سے متصادم نہیں اور اسی طرح 'استحسان' کے تصور کو ترویج دی جائے جس میں اسلامی قانون دیگر ممکنات پر منصفین کے فیصلوں کی صورت میں موجود مثالوں کو ترجیح دیتا ہے۔ اگرچہ این سی ایچ آر ایکٹ کا سیکشن 9 ان اقدامات کو آگے بڑھانے کے لئے خاصے اختیارات دیتا ہے لیکن پھر بھی این سی ایچ آر کو مرکزی دھارے میں لانے اور اس بات کو یقینی بنانے میں کچھ وقت لگے گا کہ ان آدرشوں کو از سر نو استوار کیا جائے جن کی خاطر پاکستان تخلیق کیا گیا تھا۔

پرتشدد انتہاپسندی کے ازالہ کے لئے کیا ہمیں دوسرے ملکوں میں یا خود پاکستان میں کوئی عمدہ مثالیں / طریقے ملتے ہیں؟

جرمنی کا سوشل سروس لاء بہت مفید ہے۔ یہ سکول کی عمر کے کم سن بچوں کو دوسروں کے ساتھ برتاؤ کے آداب سکھاتا ہے۔ اس طرح کی بنیادی سطح کی تربیت کسی بھی فرد کی پوری زندگی سدھار دیتی ہے جس کی بدولت وہ اس انداز میں چلتا ہے کہ جس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے۔ ہمیں اگر تبدیلی لانی ہے تو جڑوں کو ٹھیک کرنا ہوگا۔

say that again

نظریات کی تشریح پر بار بار پیدا ہونے والے تصادم نے ملک میں پرتشدد انتہاپسندی کی راہ ہموار کی۔

Picture Credits: DAWN Newspaper

انٹرویو

لیلیٰ بخاری

سٹیٹ سیکرٹری، پرائم منسٹرز آفس، اوسلو (ان دنوں بچے کی پیدائش کے باعث رخصت پر ہیں)
ریڈیکلائزیشن اور پرتشدد انتہاپسندی کے خلاف ناروے حکومت کے ایکشن پلان پر کام کر چکی ہیں۔

کیا آپ ہمیں ریڈیکلائزیشن کے خاتمہ کے لئے ناروے حکومت کی حکمت عملی کے بارے میں بتا سکتی ہیں اور اس پر کس طرح عملدرآمد کیا جا رہا ہے؟

گزشتہ کچھ سالوں سے کئی یورپی ممالک ریڈیکلائزیشن کے خاتمہ کے لئے اپنی جامع قومی حکمت عملیاں وضع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ متعدد ممالک انتہاپسندی کے وحشیانہ پرتشدد حملوں کی زد میں آ چکے ہیں جبکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے اور خفیہ ادارے ایسے کئی واقعات کو ناکام بنا چکے ہیں۔ حکومتی کوششوں کے باوجود لگتا ہے کہ ریڈیکلائزیشن کا شکار نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ناروے میں ہم اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ریڈیکلائزیشن مختلف اقسام کی مذہبی اور ثقافتی شناخت کا اثر ہے کیونکہ ہمارے ہاں ایک طرف دائیں بازو کے انتہاپسند ہیں تو دوسری جانب ریڈیکل اسلامسٹ۔

2014 میں ناروے نے پرتشدد انتہاپسندی اور ریڈیکلائزیشن کے خلاف اپنے دوسرے ایکشن پلان پر نظرثانی کے بعد اس کا اجراء کیا جو معاشرے کے تمام طبقات کو شامل کرنے اور ساتھ ملانے کا ایک جامع فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ریڈیکلائزیشن مختلف نظریاتی سمتوں سے ابھر کر سامنے آ سکتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی اقدار اور ڈھانچوں کو اس طرح مضبوط بنائیں کہ ہر شہری اپنے اظہار اور قومی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے لئے آزاد ہو۔ ہم نے جب ایکشن پلان کی تیاری کا کام شروع کیا تو وزیراعظم اور مختلف وزارتوں نے تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے صف اول کے ماہرین اور سول سوسائٹی کرداروں کو دعوت دی اور ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہوئے اس بات کو یقینی بنایا کہ ہر شخص ہماری اس حکمت عملی کا حصہ ہو۔ ایکشن پلان میں تیس مختلف پالیسیاں تشکیل دی گئی ہیں جن میں انسداد دہشت گردی سے منافرت پر مبنی تقریر اور سکولوں کی ریگولیشن تک ہر طرح کی سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس ایکشن پلان میں پرتشدد انتہاپسندی میں اضافے کی روک تھام اور اس سے باز رکھنے کے لئے سخت اور نرم دونوں طرح کی حکمت عملیوں کو آپس میں ضم کیا گیا ہے۔ اس کے اجراء کے وقت سے ہی مجھے دیگر باتوں کے علاوہ ناروے بھر میں مقامی سطح کی کمیونٹیز میں ان اہداف پر عملدرآمد میں خصوصی دلچسپی رہی ہے۔ ان کمیونٹیز نے اس ایکشن پلان کو ایک ایسی زندہ و جاوید دستاویز، جو لوگوں کی آراء کی نمائندگی کرتی ہو، کی شکل دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے اور اس سلسلے میں تعاون کیا ہے۔

کیا اس ایکشن پلان میں نیچے سے اوپر کی طرف جانے والی سوچ اپنائی گئی ہے؟ ایکشن پلان کے اثرات کا تجزیہ آپ کس طرح کرتے ہیں؟

میرے خیال میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر جوابی آراء یہ رہی ہیں کہ ایکشن پلان کی تشکیل اور اس پر عملدرآمد بیک وقت ہوا ہے اور یوں اس میں نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے دونوں طرح کی سوچ اپنائی گئی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پرتشدد انتہاپسندی کی روک تھام میں کامیابی یقینی بنانے کے لئے قیادت ناگزیر ہے۔ اس کے لئے ہمیں ریاست کے سبھی مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ مقامی شہریوں مثلاً اساتذہ وغیرہ میں سے بھی لیڈروں کی ضرورت ہے تاکہ ان کے عمل اور رویئے کے مطابق ان کی ترجیحات کو سمجھا جا سکے اور انہیں ایکشن پلان میں ضم کیا جا سکے۔ یہ سبھی حلقوں کو شامل کرنے والی وسیع سوچ ہے جس میں معاشرے کے ہر فرد کو ساتھ ملایا جا رہا ہے۔ اس میں شامل لیڈروں کو اس مسئلے کو ترجیحی حیثیت دینا ہوگی، اسے پالیسی ایجنڈا پر لانا ہوگا اور بجٹ میں بھی اسے پیش نظر رکھنا ہوگا۔

اس تمام تر کام کے اثرات کی پیمائش ایک مشکل کام ہے کیونکہ ایسے لوگوں کی تعداد کا تعین تقریباً ناممکن سی بات ہے جو ریڈیکلائزیشن کا شکار نہیں ہوئے۔ تاہم، ہم اس کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لئے اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ ہر عام شہری ایکشن پلان کی ہدایات ٹھیک طریقے سے سمجھ لے۔ اسی طرح اس حکمت عملی کی مسلسل نگرانی اور جانچ پرکھ کا کام بھی جاری ہے اور اثرات میں بہتری لانے کے لئے متعدد اجزاء میں ترامیم کی گئی ہیں۔ ہمارا ایکشن پلان محض ریڈیکل اسلامزم تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ دائیں بازو کی انتہاپسندی اور ان متعلقہ فریقوں کا احاطہ بھی کرتا ہے جو ان مشکلات پر قابو پانے کے لئے کام کر رہے ہیں۔

ان کی صحیح معنوں میں نشاندہی زمینی سطح پر موجود ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ عمومی بنیاد پر پرتشدد انتہاپسندی کو آگے بڑھانے والے عوامل کئی ہو سکتے ہیں جن میں معاشی، سیاسی اور شناخت سے متعلق گلے شکوے وغیرہ شامل ہیں۔ دیگر باتوں کے علاوہ اس کی تاریخ کی بناء پر بھی پاکستان کا معاملہ خاص ہے۔

اپنے تجربے اور پس منظر کے علاوہ ناروے کے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے کیا آپ کسی ایسے بہترین طریقوں یا سبق کے بارے میں بتا سکتی ہیں جو پرتشدد انتہاپسندی کے مسئلے سے نمٹنے کے لئے پاکستان میں بھی کام آ سکتے ہوں؟

کوئی نتائج اخذ کرنے کے لئے ایک ملک کا دوسرے ملک سے موازنہ خاصا مشکل ہوتا ہے کیونکہ ہر ایک کا اپنا تاریخی، ثقافتی و سیاسی تجربہ اور ماحول ہوتا ہے۔ پاکستان کو پرتشدد انتہاپسندی سے درپیش خطرے کی شدت اور اس کی سطح نمایاں حد تک وسیع ہے۔ یہ باتیں اپنی جگہ، میرے خیال میں پہلا قدم یہ ہونا چاہئے کہ ایک موثر ایکشن پلان وضع کیا جائے جس میں نچلی سطح کے عام شہری سے لے کر وزیراعظم تک ہر شخص کی آراء اور خواہشات شامل ہوں۔ سب کی شمولیت اس عمل میں بہت اہم ہے۔ ہم مقامی حکومتوں اور کمیونٹیز کے ساتھ مل کر کام کر چکے ہیں جنہوں نے انتہاپسندی سے نمٹنے کے لئے موثر مقامی ماڈلز تیار کئے جنہیں کسی دوسری جگہ اسی شکل میں اپنایا جا سکتا ہے۔ گزشتہ سال ہم نے ایک یورپی کانفرنس کا اہتمام کیا جس میں مقامی میئرز نے پولیس، مقامی مذہبی لیڈروں، یوتھ کلب وغیرہ کے ساتھ مل کر کئے گئے کام سے متعلق اپنے تجربات کا تبادلہ کیا تاکہ انتہاپسندانہ رجحانات کی نشاندہی، ان کا خاتمہ اور روک تھام کی جا سکے۔

say that again

معاشرے کے مختلف طبقات کی موثر قیادت اور اس سلسلے میں کی جانے والی تمام کوششوں میں دیانتداری پرتشدد انتہاپسندی کے خلاف مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

انٹرویو

پرتشدد انتہا پسندی پر اس سوچ کے گرد ایک مثبت بیانیہ کی تعمیر بھی ضروری ہے۔ قومی بیانیہ اور ڈائیلاگ اس بارے میں ہونا چاہئے کہ شہری کس طرح کا معاشرہ تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اس مرحلے میں تنوع، برداشت اور کثیر الثقافت جیسی اقدار پر تشدد انتہا پسندی کے خلاف مہم کو ایک مثبت تاثر دے سکتی ہیں۔ میرے خیال میں اس سے ایک دور خاسبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔ پہلا، مختلف متعلقہ فریقوں کے درمیان موثر کوآرڈینیشن ہے جس میں وزراء، سول سوسائٹی گروپ، شعبہ تعلیم سے وابستہ افراد، مقامی مذہبی قائدین وغیرہ شامل ہیں۔ دوسرا، جب اس حکمت عملی کو لچکدار، موثر اور پائیدار بنانے پر کام ہو رہا ہو تو اس میں سب کا شامل رہنا ضروری ہے۔ ایک بار جب ترجیحات طے ہو جائیں تو پھر ضروری ہے کہ اس پر ثابت قدم رہیں، مقامی کمیونٹیز کے ساتھ میل جول برقرار رکھا جائے اور پالیسیوں کے ساتھ وفاداری کا اظہار کیا جائے۔

ناروے میں پاکستانی تارکین وطن کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو یہاں کامیاب ہیں اور اہمیت رکھتے ہیں۔ آپ ناروے میں جو کچھ کر رہی ہیں اور دوسری طرف پاکستان میں جو کوششیں کی جا رہی ہیں ان میں آپ پاکستانی نارویجنز کے کردار کو کس طرح دیکھتی ہیں؟

میرے خیال میں پاکستانی نارویجنز کو بھی اس میں ایک کردار ادا کرنا ہے لیکن ان شہریوں پر یہ کردار تھوپا نہیں جا سکتا۔ یہ تارکین وطن ناروے کے تمام باشندوں کے لئے مثبت رہتے ہوئے اور کامیاب مثالی کردار کے طور پر کام کرتے ہوئے انتہا پسندی کے خلاف کوششوں میں اپنا حصہ ملا رہے ہیں۔ اس سے پاکستانیوں سے متعلق منفی پیغامات کا تدارک کرنے میں مدد ملتی ہے اور ایسی موثر مثالیں بھی سامنے آتی ہیں جو نوجوانوں کے لئے متاثر کن ہیں۔ اپنے آبائی وطن کے حوالے سے کسی پر ذمہ داریاں مسلط تو نہیں کی جا سکتیں لیکن میں سمجھتی ہوں کہ نارویجن پاکستانی صحت اور تعلیم جیسے ترقیاتی منصوبوں میں حصہ لے کر اپنے ملک کی سماجی ترقی میں اپنا کردار ضرور ادا کر سکتے ہیں۔ بہرحال پاکستان ان کی شناخت کا ایک اہم جزو ہے (کچھ لوگوں کے لئے، سب کے لئے نہیں) اور کئی ایسے ہیں جو اپنے گھر والوں کے ساتھ رابطے برقرار رکھتے ہیں۔ ایک بھرپور اور مثبت تعلق دونوں ملکوں کی کمیونٹیز کے ارتقاء کے لئے سودمند ہے۔

آپ اس بارے میں کیا کہیں گی کہ پاکستان میں پرتشدد انتہا پسندی کے اہم محرکین کون کون سے ہیں؟

میں سمجھتی ہوں کہ پاکستانی عوام اپنے معاشرے اور اس کے مخصوص ماحول کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور میرا یقین ہے کہ وہ دہشت گردی اور پرتشدد انتہا پسندی کی لعنت کو شکست دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ محرکین کوئی بھی ہو سکتے ہیں، معاشی بھی اور سیاسی گلے شکوے بھی، بیگانگی بھی اور شناخت کے مسائل بھی۔ میرے خیال میں منافرت پر مبنی تقریر جیسے عوامل سب سے اہم ہو سکتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے، مثال کے طور پر اقلیتوں کے بارے میں جس انداز میں بات کرتے ہیں وہ ہمارے رویوں، احساس ذمہ داری اور سماجی بندھنوں پر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔ میں اس بات پر زور دوں گی کہ معاشرے کے سبھی مختلف طبقات کی موثر قیادت اور اس سلسلے میں کی جانے والی تمام کوششوں میں دیانتداری پرتشدد انتہا پسندی کے خلاف کاوشوں میں مدد دے سکتی ہے۔ تعلیم اور روزگار کے مواقع بہت ضروری ہیں جس سے نوجوانوں کو مستقبل کے لئے امید ملتی ہے۔ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ بھی اہم ہے یعنی کس طرز کے معاشرے کی خاطر کام کر رہے ہیں، اپنے ہم وطنوں، اپنے پڑوسیوں وغیرہ کو ہم کس طرح دیکھتے ہیں۔ شفاف، پرعزم اور باہمی طور پر سرگرم قیادت ناگزیر ہے اور اس بات کا اعتراف بھی کہ ہمیں ایک مسئلہ درپیش ہے جس سے ہمیں نمٹنا ہے۔

آپ نے ذکر کیا کہ ناروے کے شہروں اور مقامی کمیونٹیز نے انتہا پسندی سے باز رکھنے کے لئے اپنے طور پر موثر ماڈل تیار کئے ہیں۔ کیا آپ ہمیں کوئی مثالیں دے سکتی ہیں کہ کن اقسام کے ادارے یا طریقے وضع کئے گئے ہیں اور ان پر عملدرآمد کیا جا رہا ہے؟

ان میں سے بعض کمیونٹیز نے کشادہ، سب کی شمولیت پر مبنی اجلاسوں اور ڈائیلاگ کے لئے پلیٹ فارم تشکیل دیئے ہیں۔ ان میں میئرز آفس، لوکل اتھارٹیز کے دفاتر، نوجوانوں کے کلب، مقامی ثقافتی مراکز سمیت ہر طرح کے پلیٹ فارم شامل ہیں۔ اس طرح کی کھلی جگہیں بنانے کا مقصد یہ ہے کہ مختلف کردار یہاں اکٹھے ہو کر اپنی بھڑاس نکال سکیں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ ان کے گلے شکوے سنے جائیں۔ اس میل جول سے شرکاء کو ایک دوسرے کی ذمہ داریاں اور حقوق سمجھنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ مثال کے طور پر پولیس افسران باقاعدگی کے ساتھ مقامی کمیونٹی ارکان سے ملاقاتیں اور میل جول کرتے ہیں جس سے اعتماد بڑھتا ہے، ذاتی تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور انفرادی و سماجی بندھن مضبوط ہوتے ہیں۔ ان نیٹ ورکس کی تعمیر سے حکام کو ریڈیکل اور انتہا پسند افراد کا بروقت پتہ لگانے کا موقع ملتا ہے اور یوں وہ روک تھام کے اقدامات کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ کشادہ پلیٹ فارم دوسرے ممالک اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے ماہرین کو بھی موقع دیتے ہیں کہ وہ آگے آئیں اور نچلی سطح کی کمیونٹیز کو اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔

انٹرویو

رضا احمد رومی

مصنف، صحافی، انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ پریکٹیشنر
سکالر ان ریزیڈنس، اتھاکا کالج، نیویارک
وزیٹنگ فیکلٹی، نیویارک یونیورسٹی
کنسلٹنگ ایڈیٹر، دی فرائیڈے ٹائمز

say that again

غربت کی وجہ سے ان پڑھ نوجوان انتہاپسندی کے کاروبار میں بھرتی ہو جاتے ہیں اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے لوگ مدارس کی طرف مائل ہوتے ہیں۔

پاکستان میں پرتشدد انتہاپسندی کے بنیادی محرکین کیا ہیں؟

پاکستان میں انتہاپسندی کا مسئلہ سالہا سال کے عرصے میں یکسر بدل چکا ہے۔ بڑی حد تک یہ ماضی کی پالیسیوں سے جڑا ہے جن میں 1980 اور 1990 کی دہائیوں کے دوران اپنائی گئی پالیسیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جہاد کو خارجہ پالیسی کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا جس کے تحت افغانستان اور بھارت کے زیر قبضہ کشمیر میں ملیشیا گروپوں کو تربیت دی گئی۔ بدقسمتی سے بین الاقوامی برادری بالخصوص مغرب اور سعودی عرب نے بھی اس میں اپنا کردار ادا کیا۔ تاہم ضروری تھا کہ قومی مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا اور ایسی خطرناک راہوں پر چلنے سے گریز کیا جاتا۔

دوسری طرف مدرسوں کے پھیلاؤ نے، جن کی تعداد اب تقریباً چالیس ہزار تک پہنچ چکی ہے، بھی لوگوں میں ایسی باتیں پیدا کرنے میں اپنا کردار ادا کیا جو مذہب کے نام پر تشدد کو جائز سمجھتی ہیں۔ 1980 کی دہائی کے دوران پاکستانی حکومت نے بھی سکولوں کا نصاب تبدیل کیا اور اسے مذہبی رنگ دیا جس میں ایک مرکزی طرز تعلیم کے طور پر جہاد کے مضمون کا اضافہ بھی شامل تھا جو 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں وزارت تعلیم کی طرف سے جاری کی جانے والی ہدایات اور سرکلرز سے سامنے آتا ہے۔ دوسری جانب غربت اور عوامی سہولیات مثلاً سکولوں تک رسائی کے فقدان جیسے مسائل نے بھی بے پناہ کردار ادا کیا۔ غربت کی بدولت ان پڑھ نوجوانوں کو انتہاپسندی کے کاروبار میں بھرتی کرنے کا موقع پیدا ہو جاتا ہے اور تعلیم کی کمی مدارس کو اس مقصد کے لئے پرکشش بنا دیتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مدارس میں داخلے کا کل تناسب خاصا کم یعنی پانچ فیصد کے لگ بھگ ہے لیکن سب نہیں بلکہ ان میں سے کچھ مدارس ریڈیکل ازم کو جذب کرتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

پرتشدد انتہاپسندی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے کون کون سے اقدامات ہونے چاہئیں؟

پاکستان میں آبادی کے اعتبار سے جو تبدیلیاں آ رہی ہیں ان کے پیش نظر ضروری ہے کہ ہر سال روزگار کے لاکھوں مواقع پیدا کئے جائیں۔ لہٰذا اس کا اور کوئی متبادل نہیں سوائے اس کے کہ روزگار کی منڈی میں قدم رکھنے والے نوجوانوں کی بڑی تعداد کے لئے معاشی مواقع پیدا کئے جائیں۔ لیکن یہ محض ایک پہلو ہے۔ نصاب، مدرسوں، مسجدوں اور میڈیا پر ہونے والی بحثوں کے ذریعے جو نظریاتی یلغار ہو رہی ہے اسے بھی تبدیل کرنا ضروری ہے۔ ہمیں اس جانب قدم بڑھانا ہوگا کہ: الف) مدرسوں کی رجسٹریشن اور ریگولیشن کی جائے۔ ب) نصاب میں بڑے پیمانے پر اصلاح کی جائے۔ ج) مسجدوں کے امام صاحبان سند یافتہ ہونے چاہئیں۔ د) مسلمانوں کے اندرونی گروہوں اور ظاہر ہے غیر مسلم اقلیتی گروہوں کے خلاف منافرت پر مبنی تقریر پر قانونی چارہ جوئی کی جائے۔ مختصراً اس کا مطلب یہ ہے کہ نیشنل ایکشن پلان، 2014 پر پسند ناپسند کی بنیاد پر نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں من وعن عملدرآمد کیا جائے۔ ایک اور بڑا اور دیرینہ مسئلہ شہریت کا ہے۔ ہم آج بھی بلوچستان کے علاقوں، وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقہ جات (فاٹا)، آزاد جموں وکشمیر، گلگت بلتستان اور خیبر پختونخواہ کے بعض علاقوں کو نوآبادیاتی قوانین کے تحت چلا رہے ہیں جو استبدادی ہیں اور لوگوں کو بنیادی حقوق سے محروم کرتے ہیں۔ ان علاقوں کو مرکزی دھارے میں لانے اور انہیں یہ احساس دینے کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ انصاف ہو رہا ہے۔ فوجداری نظام انصاف میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے جس میں عدالتی نظام خاص طور پر قابل ذکر ہے جو زیر التواء مقدمات، ضابطے کی فرسودہ کارروائیوں اور مہنگی قانونی کارروائیوں سے اٹا پڑا ہے جن کی وجہ سے لوگوں کی وسیع اکثریت انصاف تک رسائی سے محروم ہے۔ ان حالات کا جلد از جلد ازالہ کرنا ہوگا۔

پرتشدد انتہاپسندی کے ازالہ کے لئے کیا ہمیں دوسرے ملکوں میں یا خود پاکستان میں کوئی عمدہ مثالیں/طریقے ملتے ہیں؟

اس حوالے سے عمدہ طریقہ کسی ایک ماڈل کا نام نہیں۔ مثالیں ہر طرح کی ہیں۔ ایک طرف سری لنکا ہے جس نے انتہاپسندوں کے خلاف ایک طویل جنگ لڑی اور دوسری جانب تیونس ہے جہاں اب اصلاحات متعارف کرائی گئی ہیں۔ سری لنکا میں لڑائی کے دوران کئی زیادتیاں ہوئیں اور تیونس کے نوجوان آج بھی آئی ایس آئی ایس میں شامل ہو رہے ہیں۔ پاکستان کو اپنا ایک ماڈل تخلیق کرنا ہوگا۔ بیشتر مسلم اکثریتی ممالک پرتشدد انتہاپسندی کے چیلنجوں سے نبرد آزما ہیں۔ تنازعات ہر جگہ چل رہے ہیں۔ بعض معاشروں میں سیکولر سوچ کے تحت کئے جانے والے ظالمانہ اقدامات الٹے پڑ گئے ہیں جیسے ترکی، مصر اور انڈونیشیا کے علاوہ کسی حد تک بنگلہ دیش کو بھی لے لیں۔ تاہم تیونس میں سیاسی استحکام نے انتہاپسندی کو پیچھے دھکیلنے کا کام دیا ہے۔ پاکستان کی اپنی ایک تاریخ اور برداشت کی اپنی اقدار ہیں۔ یہ وہ خطہ تھا جہاں مختلف مذاہب کے لوگ صدیوں سے قدرے امن کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔ ہمیں اس پہلو پر زور دینا ہوگا اور ساتھ ہی یہ بھی یقینی بنانا ہوگا کہ ہم خطے میں امن کے سفیر بن کر دکھائیں۔ اس کے لئے بھارت کے ساتھ تعلقات معمول پر لانا ہوں گے، ایران کے ساتھ تعلقات بہتر بنانا ہوں گے اور افغانستان میں امن عمل کی راہ ہموار کرنا ہوگی۔ دنیا بھر سے ایک قابل عمل ماڈل یہ ملتا ہے کہ ریاست ایک غیر جانبدار ثالث کا کردار ادا کرے اور اس کی کوئی مذہبی شناخت نہ ہو۔ حالیہ صدی سے یہی سبق ملتا ہے۔

Picture Credits: Ithaca College

انٹرویو

شیری رحمان

نائب صدر پاکستان پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرینز (پی پی پی پی)
سربراہ جناح انسٹی ٹیوٹ
سابق پاکستانی سفیر برائے امریکہ
سابق وفاقی وزیر اطلاعات

say that again

ایک ایسے وقت میں جب ان قوتوں کو نیچا دکھانے
کا قومی عزم جواں ہے تو انتہا پسندی کے خلاف
سٹریٹجک اور سیاسی سد جارحیت تعمیر کرنا ناگزیر ہے۔

پاکستان میں پرتشدد انتہا پسندی کے بنیادی محرکین کیا ہیں؟

ایک مضبوط، مذہبی دایاں بازو ہے جس کے کمیونٹی اور سماجی خدمات پر نقوش اس کے اپنے حجم سے کہیں بڑے ہیں اور جس نے ایک طویل عرصے سے پاکستان میں ترقی پسند قوتوں کو پسپائی جیسی کیفیت سے دوچار کر رکھا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ ہمیں اس استحقاق اور گنجائش پر وسیع تر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے جو مذہبی دائیں بازو کو ملی ہوئی ہے۔

آج جو کچھ ہمارے سامنے ہے یہ انتہا درجے کی عدم برداشت کا باعث بنا ہوا ہے جو آج پاکستان میں پرتشدد انتہا پسندی کا واحد نہ سہی لیکن نمایاں محرک ریڈیکلائزیشن کا شکار، تنہائی پسند بیانیہ ہے جو ایک طویل عرصے سے بے لگام فروغ پذیر ہے۔ ''ہم اور وہ'' والے اس بیانیہ نے ہمارے معاشرے کو بری طرح زبوں حالی کا شکار بنا دیا ہے اور ہمیں مذہبی، فرقہ وارانہ اور نسلی خطوط پر تقسیم کر دیا ہے۔

بذات خود ریڈیکلائزیشن کے کئی محرکین ہیں جن میں انتہا پسندانہ نظریات کے بے روک ٹوک پھیلاؤ سے لے کر نفسیاتی بدنظمی اور سماجی و اقتصادی محرومی تک ہر طرح کے عوامل شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے انتہا پسند گروہ جوابی بیانیہ اور مخالفت کو دبانے کے لئے تشدد اور ڈراؤ دھمکاؤ کا راستہ اپناتے رہے ہیں اور دوسری جانب وہ اپنے ریڈیکل نظریات کے تحت لوگوں کو بھرتی کرنے کے لئے معاشی مراعات اور فلاحی امداد فراہم کرتے ہیں۔ یہ انتہا پسند گروہ لوگوں کی سیاسی شکایات کو بھی اپنے آلہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

کیا پرتشدد انتہا پسندی کے تدارک کو پاکستان کے مجموعی پالیسی فریم ورک میں ترجیح دی جاتی ہے؟ اس ضمن میں پالیسی، قانونی اور انتظامی اعتبار سے کن کن تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟

نیشنل ایکشن پلان، پاکستان کی تاریخ کی ان گھڑیوں میں سے ایک تھا جس سے ہمیں ملک سے محض دہشت گردی کے خاتمہ ہی نہیں بلکہ پرتشدد انتہا پسندی کے تدارک کے اقدامات کو بھی باہم مربوط بنانے کا موقع ملا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مدارس کی رجسٹریشن اور اصلاح سمیت اس پلان پر پیشرفت اس طرح نہیں رہی جس طرح ہونی چاہئے تھی۔ ایک طرف متعدد این جی اوز وزارت داخلہ کی کڑی بازپرس کی زد میں ہیں لیکن دوسری جانب مدارس آج بھی حکومت کی پہنچ سے باہر ہیں۔

اس وقت ملک میں 8,249 مدارس ایسے ہیں جو آئی ٹی ایم پی یا حکومت میں سے کسی کے پاس بھی رجسٹرڈ نہیں ہیں جن میں تقریباً تین لاکھ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ ان کی مذہبی وابستگی، فنڈز کے ذرائع اور مقام نہ صرف بڑی حد تک نامعلوم ہیں بلکہ حکومتی پڑتال اور نگرانی کی عدم موجودگی میں ان کے طلبہ مکمل طور پر مدرسہ انتظامیہ کے کنٹرول میں ہیں۔ اگرچہ حکومتی حلقے دعویٰ کرتے ہیں کہ منافرت پر مبنی تقریریں کرنے والے دو ہزار کے لگ بھگ افراد (اس حوالے سے مختلف اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں) کو گرفتار کیا جا چکا ہے لیکن ان میں سے بیشتر کو منافرت پر مبنی تقریر کی بناء پر نہیں بلکہ لاؤڈ سپیکر کے استعمال سے متعلق 1965 کے قانون کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ منافرت پر مبنی تقاریر کی روک تھام ایک اور پیچیدہ معاملہ ہے۔

نجی زندگی، اظہار کے ذرائع اور ایسی باتوں کی ریگولیشن ایک پیچیدہ معاملہ ہے جن کا برسرعام اظہار کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ عجلت میں منظور کئے گئے ''پریونشن آف الیکٹرانک کرائمز بل'' سے بھی ظاہر ہوتا ہے اس نگرانی کی سماجی قیمت ان فوائد کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہو سکتی ہے جو اس بل پر (اس کی موجودہ بحث طلب شکل میں) عملدرآمد سے منافرت پر مبنی تقریر کی نشاندہی اور اس کا پتہ لگانے کے سلسلے میں اٹھائے جا سکتے ہیں۔ تاہم پاکستان وہ واحد ملک نہیں جو اس مسئلے سے دوچار ہے۔

پرتشدد انتہا پسندی کے مسائل سے نمٹنے کے لئے کون کون سے اقدامات ہونے چاہئیں؟

پرتشدد انتہا پسندی سے نمٹنے کے لئے ایک باہم مربوط حکمت عملی وضع کی جائے جو نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی کے ایک بھرپور فریم ورک کے تحت ہو اور جس میں داخلہ، اطلاعات اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی وزارتیں مل کر کام کریں۔ لیکن اس کے لئے نیشنل کاؤنٹر ٹیررازم اتھارٹی (نیکٹا) کو بااختیار بنانا ہوگا۔ مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ جنوری میں سینیٹ کے ایک اجلاس میں وفاقی حکومت نے نیکٹا کا بجٹ بڑھانے کی ایک قرارداد پر اس بناء پر مزاحمت کی کہ فنڈز کی موزونیت کے حوالے سے مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ نیکٹا جن مقاصد کے تحت تشکیل دی گئی تھی اور جن ہدایات کے تحت اس نے کام کیا ان پر اس کی کارکردگی کے پیش نظر اس کے بجٹ میں اضافہ بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا اور اس کے ساتھ اس کی ادارہ جاتی استعداد بہتر بنانے کے لئے متعدد دیگر اقدامات بھی کئے جاتے۔ یہاں اس امر کا اعادہ ضروری ہے کہ نیکٹا کو نیشنل ایکشن پلان پر عملدرآمد کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی جس پر اس کی افادیت کے حوالے سے پہلے ہی کئی سوالات اٹھائے جا چکے ہیں۔ انتہا پسندی سے نمٹنے کے اقدامات کو اس کی جاری سرگرمیوں کے دائرے میں لانے کے لئے بھی اسے بااختیار بنانا ناگزیر تھا۔ تاہم یہ اتھارٹی ہنوز عملہ کی کمی کا شکار ہے اور اس قابل نہیں ہو پائی کہ اہم منصوبوں پر اقدامات یقینی بنا سکے جن میں سد جارحیت کا مجموعی منصوبہ اور نیشنل انٹرنل سکیورٹی پالیسی کے تحت وضع کئے گئے جامع جوابی اقدامات کے منصوبے بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں نیکٹا ایکٹ کے تحت جو اجلاس ہونا ضروری تھے وہ بارہا منعقد نہیں ہو پائے۔

دوسرا، ایک ایسے وقت میں جب ان قوتوں کو نیچا دکھانے کے لئے پوری قوم پرعزم ہے انتہاپسندی کے خلاف سٹریٹجک اور سیاسی سدجارحیت کو بہتر بنانا ازحد ضروری ہے۔ افسوس کی بات ہے، جیسا کہ تحفظ خواتین بل پر ہونے والے واویلا کی صورت میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں، انتہاپسند رجحانات کو بدستور جگہ مل رہی ہے اور انہوں نے سیاسی بیانیہ کو اپنا یرغمال بنا رکھا ہے۔ پاکستان میں لوگوں کو یہ بات واضح طور پر سمجھنا ہوگی کہ انتہاپسندانہ تشدد کے خلاف جنگ اسے بھڑکانے والے بیانیہ اور نظریات کی معتبر انداز میں درستی کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ چاہے کوئی کچھ بھی سمجھے کہ یہ کتنا کٹھن کام ہوگا لیکن سیاسی اور سٹریٹجک دونوں سطحوں پر انتہاپسندی کے خلاف ایک دیرپا زور پیدا کیا جائے (اور اسے مزید آگے بڑھایا جائے)۔

پرتشدد انتہاپسندی کے ازالہ کے لئے کیا ہمیں دوسرے ملکوں میں یا خود پاکستان میں کوئی عمدہ مثالیں / طریقے ملتے ہیں؟

صاف ظاہر ہے کہ سماجی خدمات کی فراہمی میں پائے جانے والے خلاء کو دور کرنا بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر تعلیم کے شعبے میں ماڈل موجود ہیں۔ سٹیزنز فاؤنڈیشن جو پسماندہ علاقوں میں معیاری تعلیم فراہم کرنے والے سکولوں کا ایک نیٹ ورک ہے، کی بدولت کئی والدین کو ایک راہ میسر آئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مدارس کے علاوہ کسی اور جگہ بھیج سکیں۔

کم عمری میں رواداری اور برداشت کا احساس پیدا کرنے کے لئے نصاب کی اصلاح بہت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سندھ حکومت نے سکول نصاب تبدیل کیا ہے اور سیکولرازم پر قائداعظم کی تقریر کو سلیبس میں شامل کیا ہے۔ قانون کی حکمرانی ایک اور ایسی مثال ہے۔ ظاہر ہے ہر سطح پر جمہوریت اور بازپرس کو وسیع تر سٹریٹجک مقاصد کے طور پر سویلین استعداد اور جوابی اقدامات سے ہم آہنگ بنانا ہوگا تاکہ وفاقی سطح پر کوئی خلاء باقی نہ رہ جائے۔

نوجوانوں کی آواز

مصطفیٰ شہباز

مینجمنٹ کنسلٹنٹ۔ کارنیلین

پاکستانی نوجوانوں میں عدم برداشت کی کیفیت اور پرتشدد رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

نوجوانوں کی اکثریت ایسی ہے جو پرتشدد رجحانات کی طرف جھکاؤ نہیں رکھتی۔ تاہم صوبوں کے اندرونی علاقوں میں جتنا دور آپ جاتے ہیں پرتشدد رجحانات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں میڈیا، سماجی خیالات، مروجہ ثقافتی طریقے اور تاریخی بیانیہ جیسے بیرونی عوامل، یہ سب نوجوانوں کے خیالات کی تشکیل میں اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ نوجوانوں کو صحت مندانہ کمیونٹی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے تاکہ ان کے وقت اور توانائیوں کو ان کی بھرپور استعداد کے مطابق بروئے کار لایا جا سکے۔

آپ کے تجربے کی روشنی میں نوجوان پاکستان میں مختلف اقسام کے پرتشدد بیانیہ کے تدارک میں اپنا کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ پاکستانی نوجوانوں میں فروغ امن اور برداشت کے کون کون سے مواقع اور استعداد موجود ہیں؟

سب سے پہلے تو پاکستان میں امن کے ماحول کی ضرورت ہے۔ خطے میں امن کے فقدان سے خود بخود سرمایہ کاری کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور روزگار کے مواقع کی قلت پیدا ہوتی ہے۔ دوسرا قدم یہ ہوگا کہ پاکستان کو ایک سرمایہ کار دوست خطہ بنایا جائے جہاں نوجوانوں کو روزگار کے ثمر آور مواقع میسر ہوں۔ نوجوانوں میں ایک اثر انگیز لہر پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے جس کی ایک مثال گزشتہ سال ہمیں پی ٹی آئی کے دھرنے کی صورت میں دیکھنے کو ملی جس کی قوت محرکہ نوجوان ہی تھے۔ ہمارے نوجوان قوت رکھتے ہیں، اصل ضرورت اس قوت کو کام میں لانے، مواقع پیدا کرنے اور سرمایہ کاری کی ہے۔

آپ کے خیال میں پرتشدد انتہا پسندی کی مختلف شکلوں سے نمٹنے اور ابلاغ/اظہار کے پرامن طریقے اپنانے پر ریاستی حکام اور سول سوسائٹی تنظیمیں نوجوان مردوں اور عورتوں کی حوصلہ افزائی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

ریاستی حکام کو چاہئے کہ وہ زیادہ ذمہ داری سے کام لیں اور ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہ ہوں۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ ''مثال بن کر دکھاؤ''، تو ریاستی حکام کو دراصل اس کی عملی تفسیر بننا ہوگا۔ دوسرا، نوجوانوں کے لئے ایسے معاون پلیٹ فارم پیدا کئے جائیں کہ وہ اپنا اظہار کر سکیں، اور اس کام میں سول سوسائٹی اور نوجوان دونوں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سدرا اسلفی

نوجوان کارکن و بانی

یوتھ آف فاٹا پراجیکٹ (وائی او ایف)

پاکستانی نوجوانوں میں عدم برداشت کی کیفیت اور پرتشدد رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

میرے خیال میں اس کا انحصار انہیں ملنے والے مواقع پر ہے۔ اگر آپ پاکستان پر نظر دوڑائیں تو ہمیں شمال اور فاٹا کے خطے میں ایسے نوجوان زیادہ ملتے ہیں جو پرتشدد رجحانات رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں روزگار کے مواقع کی کمی ہے اور اس لئے وہ خود بخود انہی مواقع کی طرف مائل ہوتے ہیں جو انہیں میسر ہیں یعنی عسکریت پسند گروہوں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ نوجوان جتنے کم عمر ہوتے ہیں ان کے عسکریت پسندانہ نظریات کی لپیٹ میں آنے کا خطرہ اتنا زیادہ ہوتا ہے۔

آپ کے تجربے کی روشنی میں نوجوان پاکستان میں مختلف اقسام کے پرتشدد بیانیہ کے تدارک میں اپنا کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ پاکستانی نوجوانوں میں فروغ امن اور برداشت کے کون کون سے مواقع اور استعداد موجود ہیں؟

میل جول اور ابلاغ بنیادی چیز ہے۔ شہری علاقوں اور بڑے شہروں کے زیادہ پڑھے لکھے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ فاٹا کے علاقوں کے کم پڑھے لکھے اور غربت زدہ نوجوانوں کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ ان دور افتادہ علاقوں کے نوجوانوں کو ایسے دوستوں کی ضرورت ہے جن سے وہ کوئی امید باندھ سکیں۔ بہرحال آپ کی صحبت آپ کی سوچ پر نمایاں اثر ڈالتی ہے۔ بڑے گروہوں کی شکل میں میل جول کے بجائے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ انفرادی سطح پر آپس میں میل جول پیدا کریں۔ انہیں کچھ وقت دیں۔ ان تعلقات کو آگے بڑھائیں۔ ان علاقوں کے نوجوانوں کی شخصیت میں بہتری لانے کے لئے رضا کارانہ دورے کرائیں۔ ان علاقوں کے نوجوانوں کے ساتھ اچھا وقت گزارنے پر زور دیں۔

آپ کے خیال میں پرتشدد انتہا پسندی کی مختلف شکلوں سے نمٹنے اور ابلاغ/اظہار کے پرامن طریقے اپنانے پر ریاستی حکام اور سول سوسائٹی تنظیمیں نوجوان مردوں اور عورتوں کی حوصلہ افزائی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

میرے خیال میں مالی معاونت ایک بڑا پہلو ہے۔ حکومت کو چاہئے کہ ایک مہم چلائے جس کے مکمل ہونے پر پرجوش نوجوانوں کا ایک گروپ منتخب کیا جائے جو پاکستان کے تشدد زدہ علاقوں میں جائیں اور وہاں کے نوجوانوں کے ساتھ میل جول بڑھائیں۔ انہیں مالی، جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے معاونت کی صورت میں مدد دی جائے۔

نوجوانوں کی آواز

سید علی عباس زیدی

بانی، پاکستان یوتھ الائنس، خودی پاکستان، ہائیو (کراچی)

ڈویلپمنٹ پروفیشنل اور سی وی ای ماہر

پاکستانی نوجوانوں میں عدم برداشت کی کیفیت اور پرتشدد رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

عدم برداشت اور تشدد کے خلاف جدوجہد کئی مراحل پر مشتمل ایک عمل ہے۔ کسی معاشرے میں ان رجحانات کی کیفیت کا پتہ لگانا ناممکن سی بات ہے۔ دسمبر 2014 میں اے پی ایس پشاور پر ہونے والے وحشیانہ حملے کے بعد حکومت پاکستان نے ملک میں دہشت گردی کے خلاف کریک ڈاؤن کے لئے نیشنل ایکشن پلان کا اعلان کیا۔ اگرچہ اس پلان کی افادیت کا پرچار زیادہ تر فوجی کارروائیوں، مارے جانے والے یا پھانسی پانے والے دہشت گردوں اور بند کئے جانے والے مدرسوں کی تعداد کی صورت میں کیا جاتا ہے لیکن انتہا پسند بیانیہ کو چیلنج کرنے کے وسیع تر کام پر کوئی بامعنی پیشرفت دیکھنے میں نہیں آتی۔ لہٰذا کسی خاص نقطہ نظر سے وابستگی رکھنے والے نوجوان سیاسی مفادات کے لئے تشدد اور مذہب کو استعمال کرنے کے اسی رجحان پر عمل پیرا ہیں۔

نظریہ کی خاطر کی جانے والی دہشت گردی کے خلاف جنگ جتنی فوجی کارروائیوں کی جنگ ہے اتنا ہی یہ بیانیہ کی جنگ ہے۔ تنازعات ضروری نہیں کہ محض بیانیہ میں ہی حل کر لئے جائیں بلکہ حل کی جانب قدم بڑھانے سے بندش پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے جو گروہی محرکین میں مثالیں قائم کرنے میں مدد دیتی ہے اور مطلوبہ مقاصد کی جانب معاشرے کے اجتماعی ارتقاء کو آگے بڑھاتی ہے۔ 'پیو' کے ایک حالیہ سروے سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں لوگوں کی اکثریت (62 فیصد) نے آئی ایس آئی ایس کے بارے میں کوئی حتمی رائے پیش نہیں کی جو شاید اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ بیشتر پاکستانی آج بھی اس گروہ سے پیدا ہونے والی انتہا پسندی اور دہشت گردی کے بارے میں الجھاؤ کا شکار ہیں۔

آگے بڑھانے اور پیچھے کھینچنے والے کئی ایسے عوامل ہیں جو نوجوانوں کو انتہا پسندی کے خطرے سے دوچار کرتے ہیں یعنی بین الاقوامی سیاست، اسلام ازم اور جہاد کا نظریہ، بیروزگاری، معقول ڈائیلاگ کی جگہوں کا فقدان، منفرد ثقافتی اظہار کو دبانے کی کارروائیاں، نصاب، قومی بیانیہ اور اس کی بنیادیں، انتہا پسند تحریکوں کی سرپرستی میں ریاست کا کردار اور بہت کچھ۔ بھلے لوگ یہی سمجھتے ہیں لیکن صرف مدارس کے طلبہ ہی پرتشدد انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوتے بلکہ حالیہ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالی لحاظ سے مستحکم پس منظر والے نوجوان اور یہاں تک کہ جو نام نہاد مغربی طرز تعلیم کے فارغ التحصیل ہیں، وہ بھی انتہا پسند تحریکوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ تشدد کی یہ کارروائیاں اور انتہا پسندی کے یہ خیالات اپنی نوعیت کے اعتبار سے محض مذہبی نہیں بلکہ سیاسی، سماجی اور بعض صورتوں میں ثقافتی بھی ہیں۔

آپ کے تجربے کی روشنی میں نوجوان پاکستان میں مختلف اقسام کے پرتشدد بیانیہ کے تدارک میں اپنا کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ پاکستانی نوجوانوں میں فروغ امن اور برداشت کے کون کون سے مواقع اور استعداد موجود ہیں؟

انتہا پسند تحریکیں جس طرح نوجوانوں کو اپنے چارے کے طور پر استعمال کرتی ہیں اسی طرح انتہا پسندی سے نمٹنے کی کسی تحریک میں بھی نوجوانوں کو ہی مرکزی حیثیت دینا ہوگی۔ پاکستان کی سول سوسائٹی گیارہ ستمبر کے بعد سے انتہا پسندی سے نمٹنے کے لئے مصروف پیکار ہے۔ ایک عامل جو انتہا پسندی کو آگے بڑھاتا ہے وہ معاشرے اور ریاست کے خلاف نوجوانوں میں پائی جانے والی فرسٹریشن اور ان کے گلے شکوے ہیں۔ انتہا پسندانہ خیالات لازمی طور پر ان اقدار کے خلاف ایک بغاوت کا اظہار ہیں۔ نوجوان کئی طرح کی ایسی کاوشوں کا حصہ بن سکتے ہیں جو ان کی جنریشن کے احساسات کو پوری طرح سمجھتی ہوں اور یہاں تک کہ وہ اپنے طور پر بھی ایسی کاوشیں شروع کر سکتے ہیں۔ جمہوریت، رواداری، امن اور برداشت پر مبنی پاکستان کی سماجی اساس کو واپس لانے اور اسے آگے بڑھانے کی کوئی بھی کوشش دراصل پرتشدد انتہا پسندی سے نمٹنے کی کوشش ہے۔ پہلا قدم یہ ہے کہ اس مسئلے کو سمجھا جائے۔ اگلا قدم یہ ہوگا کہ انتہا پسندانہ بیانیہ کا جائزہ بنیادی انسانی حقوق کے نقطہ نظر سے لیا جائے، مسائل کے حل پر غور وخوض کیا جائے اور کسی بھی بات کو حتمی بات سمجھنے والے کسی بھی تصور کو دور کیا جائے۔ تیسرا قدم یہ ہے کہ انتہا پسندی سے نمٹنے اور اس کے خطرات کی شدت کم کرنے میں ایک فعال کردار کی طرف قدم بڑھایا جائے۔

پاکستان کی حالت افغانستان، عراق یا شام والی اس لئے نہیں ہے کہ اس کے نوجوان اگرچہ انتہا پسندی کے خطرے سے دوچار تھے لیکن وہ جوق در جوق انتہا پسندانہ تحریکوں میں شامل نہیں ہوئے اور ان کے اندر استعداد اور مواقع موجود ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی تک بڑھتی رسائی کی بدولت ایک نئی دنیا کی راہیں کھل گئی ہیں جس سے ہماری پچھلی نسلیں آشنا نہ تھیں۔ نوجوان کسی بھی مسئلے کو اس طرح موضوع بحث بنا سکتے ہیں جس کی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، وہ جدت اور خیالات سامنے لا سکتے ہیں اور مسائل کے ایسے حل دریافت کر سکتے ہیں جو اس سے پہلے ممکن نہ تھے۔ پاکستان کے مستقبل کے بارے میں میری سوچ بہت مثبت ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ آٹھ سال کے دوران ملک کے چالیس سے زائد اضلاع میں کام کرتے ہوئے مجھے تجربہ ہوا ہے کہ نوجوان انتہا پسندی، بڑوں کی آمریت اور ایک باقاعدہ نظام اور ڈھانچے کے تحت برتے جانے والے امتیاز سے نمٹنے کے لئے سرگرم عمل ہیں۔

آپ کے خیال میں پرتشدد انتہا پسندی کی مختلف شکلوں سے نمٹنے اور ابلاغ/اظہار کے پرامن طریقے اپنانے پر ریاستی حکام اور سول سوسائٹی تنظیمیں نوجوان مردوں اور عورتوں کی حوصلہ افزائی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر اصل کام کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت جس وقت نیشنل ایکشن پلان کا مسودہ تیار کر رہی تھی تو نوجوانوں کی رائے لینے کی زحمت کیوں نہیں کی گئی؟ طلبہ یونینز ہنوز پابندی کا شکار کیوں ہیں؟ نوجوانوں کو آپ لیڈر کے بجائے لیڈر کی پیروی کرنے والا کیوں سمجھتے ہیں؟ نوجوان، سول سوسائٹی اور حکومت آپس میں قطع تعلقی کا شکار کیوں ہیں؟ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ نوجوانوں کو معاشرے میں فیصلہ سازی کے کردار دیئے ہی نہیں جا رہے۔ ''جنریشن گیپ'' بڑھ گیا ہے۔ جن نوجوانوں کو آپ حق رائے دہی سے محروم کریں گے ان کے اندر ہمیشہ ریڈیکل خیالات ہی پیدا ہوں گے۔ سول سوسائٹی محض ان کارپوریٹ این جی اوز کا نام نہیں جو ہر چیز کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتی ہے جس کی پٹی انہیں عطیہ دینے والے پڑھاتے ہیں۔ نوجوانوں کے گروپ، نوجوانوں کی تحریکیں اور نوجوانوں کے پلیٹ فارم بھی سول سوسائٹی کا ہی حصہ ہیں۔ ان پلیٹ فارموں کو ریاست و معاشرے کے باہمی تعلق کا لازمی جزو بنانا ہوگا۔ ان کی آراء کا بھی احترام کرنا ہوگا اور ان پر بھی توجہ دینا ہوگی۔ ضروری نہیں کہ آپ ایسے نئے پلیٹ فارم تیار کریں جو زیادہ دیرچل ہی نہ پائیں بلکہ پہلے سے موجود انہی کاوشوں کو آگے بڑھائیں جو نوجوانوں میں پائی جانے والی مایوسی اور انتہا پسندی کا ازالہ کرتی ہیں۔ یہ پیغام ریاستی حکام اور سول سوسائٹی کے کرداروں کے لئے ہے کہ وقت بدل چکا ہے، نوجوان محض انہی کاوشوں کا حصہ نہیں بنیں گے جو آپ کے خیال میں درست ہیں۔ نوجوانوں کی سنیں، انہیں فیصلے کرنے کا موقع دیں، محض نوجوانوں کی آراء کی حوصلہ افزائی نہ کریں بلکہ انہیں ایک خاطر خواہ انداز میں ان سب کاوشوں کا حصہ بنائیں کیونکہ یہ نوجوان ہی ہیں جو ایک پرامن اور جنگ زدہ پاکستان کے درمیان امید کی کرن ہیں۔

نوجوانوں کی آواز

عمیر جلیانوالہ

ڈائریکٹر، سی ای او

سکول آف لیڈرشپ، کراچی

پاکستانی نوجوانوں میں عدم برداشت کی کیفیت اور پرتشدد رجحانات کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستانی نوجوانوں میں عدم برداشت کی کیفیت اور پرتشدد رجحانات بلند ہیں بلکہ شاید یہ ہماری تاریخ کی بلند ترین سطح پر ہیں۔ ہمارے مذہبی اور سماجی اداروں کی اقتدار کی جدوجہد نے ان رجحانات کو فروغ دیا ہے جن کا نتیجہ شناخت کے بحران، کٹر پسندی اور سخت گیر سوچ کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کے پرتشدد بننے کا بنیادی سبب ''حقیقی تعلیم'' کی کمی ہے یعنی وہ تعلیم جو مختلف خیالات کو کریدنے، ان کا تجزیہ کرنے اور ان کی جانچ پرکھ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ہمارے ملک کا تعلیمی نظام ہمارے نوجوانوں کو نوکریاں تلاش کرنے پر لگا دیتا ہے لیکن وہ ان کی شخصیت میں وہ نکھار پیدا نہیں کرتا جس سے وہ بہتر فرد بن سکیں۔ پاکستان کا کوئی بھی بالغ فرد پرتشدد انتہا پسندانہ بیانیہ کا شکار بن سکتا ہے کیونکہ ہمارے ہاں نظریاتی بنیاد کی کمی ہے اس لئے وہ کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں پاتے اور کبھی ایک نقطہ نظر تو کبھی دوسرا۔ لہٰذا وہ نوجوان جو مواقع کی کمی کا شکار ہے وہ سب سے زیادہ خطرے سے دوچار ہے اور مواقع کا مطلب ہے بہتر تعلیم، شائستہ اور اخلاقیات پر مبنی طرز زندگی کے ذرائع اور تعمیری سرگرمیوں میں حصہ لینے کے مواقع۔

آپ کے تجربے کی روشنی میں نوجوان پاکستان میں مختلف اقسام کے پرتشدد بیانیہ کے تدارک میں اپنا کردار کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ پاکستانی نوجوانوں میں فروغ امن اور برداشت کے کون کون سے مواقع اور استعداد موجود ہیں؟

پاکستانی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنی اپنی کمیونٹیز میں ایک مثالی کردار کے طور پر کام کرتے ہوئے نوجوانوں کے گروپوں اور نوجوانوں کی زیر قیادت تنظیموں کے ذریعے شہریت اور فروغ امن کی تحریکوں میں پیش پیش ہیں۔ اس سے سماجی شعبے میں نوجوانوں کے لئے کیریئر کے کئی مواقع پیدا ہوئے ہیں۔ کئی شعبے ایسے ہیں جن میں ہمارے نوجوان پہلے ہی آگے آگے چل رہے ہیں اور اگر آگاہی بہتر بنائی جائے، نچلی سطح پر ایڈووکیسی سرگرمیاں کی جائیں، تنوع، برداشت اور فروغ امن جیسے موضوعات پر کمیونٹی پراجیکٹس شروع کئے جائیں تو اسے مزید مستحکم بنایا جا سکتا ہے۔ ماحولیات کا شعبہ ہمارے سامنے ہے جس میں عطیہ دینے والے مختلف ادارے معاونت فراہم کر رہے ہیں اور مقامی سول سوسائٹی تنظیمیں/این جی اوز بھی نوجوان رضا کاروں کو ساتھ ملا رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود نوجوانوں کو معاشرے میں تبدیلی لانے والوں کے طور پر خدمات انجام دینا ہوں گی اور اس بات کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا کہ ہمارے ہاں ہر رنگ کے لوگ کس طرح مل کر رہتے ہیں، ہم آپس میں گفت وشنید کے لئے تیار ہیں اور ایک خوشحال مستقبل کی خاطر ہم مل کر کام کر سکتے ہیں۔

آپ کے خیال میں پرتشدد انتہا پسندی کی مختلف شکلوں سے نمٹنے اور ابلاغ/اظہار کے پرامن طریقے اپنانے پر ریاستی حکام اور سول سوسائٹی تنظیمیں نوجوان مردوں اور عورتوں کی حوصلہ افزائی میں کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

نوجوان سیکھنے اور اپنا کردار ادا کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہیں۔ سول سوسائٹی اور حکومت دونوں کو چاہئے کہ وہ ایسی تمام سرگرمیوں میں نوجوانوں کو ساتھ ملائیں، ان کی توانائیوں اور خیالات کو بروئے کار لائیں اور فروغ امن کی سرگرمیوں میں انہیں برابر کا شریک بنائیں۔ نوجوانوں کو ٹیکنالوجی کے ذریعے بھی آپس میں جوڑا جا سکتا ہے اور یوں ان کے ساتھ مل کر ایسی مہمات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے جن کے ذریعے ہم بیانیہ، لاتعلقی اور عدم برداشت کی اس جنگ کو جیت سکتے ہیں اور ایک ایسا معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جو رواداری پر مبنی نظریاتی سوچ رکھتا ہو اور جو اختلافات کا نہ صرف پوری گہرائی سے خیال رکھتا ہو بلکہ انہیں اپنا طرہ امتیاز سمجھتا ہو۔

ڈویلپمنٹ ایڈووکیٹ
پاکستان